حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہ نامہ

سب رس

فروری 2018ء
30/- روپے
ISSN 2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پرنسس اسریٰ اور رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی

سب رس کے ''آغا حیدر حسن مرزا نمبر'' کی رسم اجرا کے موقع پر رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر ایس۔اے۔شکور، پروفیسر بیگ احساس، جناب تراب الحسن اور جناب شاہد حسین زبیری

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ | شمارہ: ۲ | ماہ: فروری | سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

- ہندوستان: **300** روپے
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے
- کتب خانوں سے: **400** روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

قیمت: **30/-**

ٹائٹل: ''دو ہزار پانسو برس پرانے Paratheron ٹمپل، یونان پر چمکتا ہوا ہلیو مون جو برسوں بعد دیکھا گیا

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

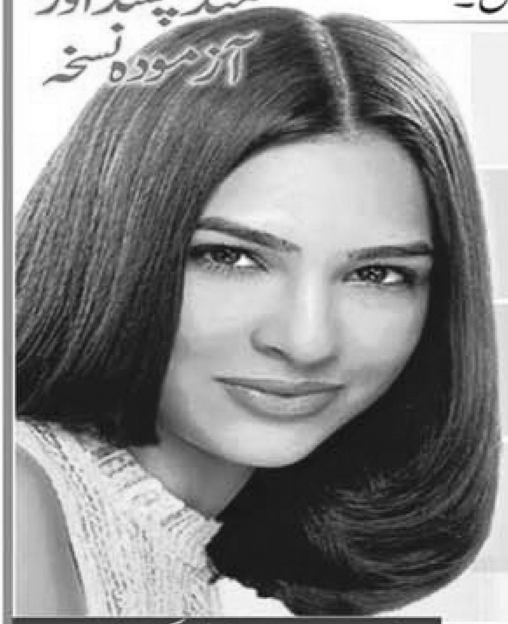

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	6

افسانے

بٹوارہ	سلام بن رزاق	8
شراتری تو.....شراتری تو	نورالحسنین	12

خاکہ

قدیر زماں	مجتبیٰ حسین	16

طنز و مزاح

مطالعہ اور بلڈ پریشر	خامہ بگوش	20

شاعری

مصطفیٰ شہاب، خلیل ماموں، اظہار وارثی، احمد نثار،	محمد عابد علی عابد، حیدر وارثی	24

مضمون

۲۰۱۷ء کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک جائزہ	اسلم جمشید پوری	36
حسی تجربوں کا شاعر.....خیالؔ	بلراج بخشی	48
رتن لعل ہانگلو کی نظمیہ شاعری کی معنویت و اہمیت	اجئے مالویہ	52
''جذبی کا تصور حسن و عشق''	محمد عرفان	55
حقیقت و رومان کا بادشاہ۔۔۔نور شاہ	توصیف مجید لون	61

مطالعہ

''لسانی مسائل و مباحث'': ایک تجزیاتی مطالعہ	مجاہد الاسلام	65

نقد و نظر

سرسید شناسی میں ایک اہم اضافہ: ''سرسید اور اردو زبان و ادب''	فیروز عالم	73
صحافتی مضامین اور ملاقاتیں.....	اے آر منظر	76

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	محبوب پاشاہ اعظمی، وسیم بیگم، انور ادیب، علیم صبا نویدی	78

اداریہ

پدماوت.....؟

جب سے سنجے لیلا بھنسالی نے ''پدماوتی'' بنانے کا اعلان کیا اور اس کی باضابطہ شوٹنگ شروع کی راجپوت کرنی سینا نامی ایک تنظیم وجود میں آئی اور اس نے اس فلم کے خلاف مظاہرے کرنا شروع کیا۔ اس کی شوٹنگ میں اڑچنیں پیدا کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ لیکن سنجے بھنسالی مستقل مزاجی سے اپنا یہ پروجیکٹ مکمل کرتے رہے۔ فلم مکمل ہوکر ریلیز کے لیے تیار ہوئی تو سنسر نے اسے پاس کر دیا۔ بھنسالی نے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اس کا نام بدل کر پدماوتی سے پدماوت کر دیا۔ انھوں نے فلم کی نمائش سے قبل کرنی سینا کو دکھانے کی پیش کش بھی کی، کرنی سینا کے صدر لوکیندر سنگھ کالوی پہلے تو مان گئے اس کے بعد مکر گئے۔ فلم کی نمائش کے لیے سپریم کورٹ سے اجازت بھی مل گئی اس کے باوجود ہنگامے جاری رہے۔ سارے ملک میں پرتشدد مظاہرے کیے گئے۔ قومی شاہراہوں پر جگہ جگہ رخنے ڈالے گئے۔ ملک کے مختلف شہروں کے سنیما گھروں پر پولیس کے دستے متعین کیے گئے۔ بعض ریاستوں میں فلم کی نمائش ہی نہیں کی گئی۔ جن میں راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش اور گوا شامل ہیں۔ حد یہ کہ شرپسندوں نے گرگاوں میں اسکول بس پر حملہ کر دیا جس میں کمسن بچے گھر واپس ہو رہے تھے۔ ڈرائیور کی عقل مندی سے کوئی بچہ زخمی نہیں ہوا۔ یو پی کی ایک تنظیم کان پور کشتریہ مہا سبھا نے اعلان کیا کہ جو بھی شخص اداکارہ دیپکا پڈکون (جس نے پدماوت کا رول کیا ہے) کی ناک کاٹے گا اسے کڑوڑ ہار وپے نقد انعام دیا جائے گا۔ مدھیہ پردیش کے ضلع رتلام میں راجپوت کرنی سینا کی 27 خواتین نے صدر جمہوریہ پر زور دیا کہ وہ اس فلم کی ریلیز رکوادیں یا پھر ان خواتین کو خودکشی کی اجازت دیں۔ عوامی املاک کو نقصان پہنچانے پر گجرات میں 118 افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنا نقصان ہوا ہوگا۔ آخر یہ ہنگامہ کیوں کیا گیا؟

آیئے ذرا تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ ''پدماوت'' صوفی ملک محمد جائسی نے علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت کے دوسو برس بعد لکھی۔ یہ راجہ رتن سین اور رانی پدمنی (پدماوتی) کی محبت کا قصہ ہے۔ شاعر نے اس رزمیہ کو دلچسپ بنانے کے لیے سلطان علاؤالدین خلجی کو بھی شامل کرلیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پدماوتی کی خوب صورتی سے ہندو راجہ ہی نہیں مسلمان بادشاہ بھی متاثر تھے۔ خلجی نے محض اسے حاصل کرنے کے لیے چتوڑگڑھ کے قلعے پر حملہ کیا۔ مورخین نے لکھا کہ یہ قصہ محض فرضی ہے۔ اس زمانے میں اس نام کی کوئی رانی چتوڑگڑھ میں موجود ہی نہیں تھی۔ ملک محمد جائسی نے اپنے رزمیے میں لکھا کہ علاؤالدین خلجی اپنے ایک برہمن درباری کی زبانی رانی پدماوتی کے حسن و جمال کا حال سن کر اسے حاصل کرنے کے لیے چتوڑگڑھ کے قلعے کا محاصرہ کرلیتا ہے۔ مگر آٹھ برس تک قلعہ فتح نہیں ہوتا۔ چتوڑگڑھ کے عوام محاصرے کی تاب نہ لاکر سلطان سے صلح کر لیتے ہیں اور انہیں قلعہ آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سلطان، راجہ رتن سین کے اخلاق اور مہمان نوازی سے متاثر ہوتا ہے۔ رانی پدماوتی کی ایک جھلک دیکھ کر وہ بے تاب ہو جاتا ہے۔ قلعے سے واپس آ کر وہ راجہ کو اپنے خیمے میں بلاتا ہے اور اسے گرفتار کر لیتا ہے۔ ادھر رانی اپنے راجہ کے فراق میں بے قرار ہو جاتی ہے راجہ کو خلجی کی قید سے چھڑانے کے لیے وہ خود کو سلطان کے سامنے پیش کرنے کا اعلان کرتی ہے اور طمطراق کے ساتھ خلجی کے محل پہنچتی ہے اور اپنے ساتھ آنے والوں کی مدد سے راجہ کو خلجی کی قید سے چھڑا لیتی ہے۔ خلجی اس ناکامی پر طیش میں آ کر چتوڑ گڑھ پر فیصلہ کن حملہ کرتا ہے اور قلعہ فتح کر لیتا ہے۔ رانی پدماوتی خلجی کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بہتر یہ سمجھتی ہے کہ قلعے کی دیگر خواتین کے ساتھ مل کر آگ کے الاؤ میں کود جائے اور خود کو ختم کر لے۔ آگ میں کودنے کی اس رسم کو جوہر کہا جاتا ہے۔ اس رسم کو ادا کرنے کی وجہ سے رانی پدماوتی کو ہندو لوک کہانیوں میں دیوی مانا جاتا ہے۔

اب اگر فلم کی کہانی بھی یہی ہے تو پھر ملک میں ہنگامہ آرائی کیوں کی گئی جب کہ رانی کا کردار تو بے داغ اور پتی ورتا دکھایا گیا ۔ بدنامی تو علاؤالدین خلجی کی ہوئی ہے کہ وہ حسن کا رسیا ہے۔ ایک غیر عورت کو حاصل کرنے کے لیے ایک قلعے پر حملہ کر دیتا ہے۔ آٹھ سال تک قلعے کا محاصرہ کرتا ہے۔ اس کے شوہر کو گرفتار کر لیتا ہے۔ ہندوستان کے ایک عدل پرور، منصف مزاج، عالی ظرف، وسیع النظر بادشاہ کی عزت خاک میں ملا دی گئی۔ اس دور کی سب سے معتبر تاریخ ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ضیاءالدین برنی نے اس واقعے کا ذکر ہی نہیں کیا۔ جب کہ وہ انتہائی متعصب اور تنگ نظر مورخ تھا اور علاؤالدین خلجی سے اسے ایک طرح کی مخاصمت تھی۔ اس نے ایسے ایسے واقعات ڈھونڈ کر لکھے جن سے علاؤالدین خلجی کے شبیہ بگڑے۔ مگر اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس واقعے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ علاؤالدین خلجی نے جب چتوڑ فتح کیا تو ان کے ہمراہ معروف موسیقار، شاعر و عالم امیر خسرو بھی تھے۔ امیر خسرو نے بھی اس کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ملک محمد جائسی کی نظم 1540 میں لکھی گئی جب کہ ہندوستان کا حکمران شیر شاہ سوری تھا۔ پتہ نہیں اس بے بنیاد واقعے میں ایسا کیا نظر آیا کہ سنجے لیلا بھنسالی نے 91 کروڑ خرچ کر کے یہ فلم بنائی۔ ادھر مسلم عہد کو ہندوستان کی تاریخ سے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے یا اسے مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے یہ فلم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔ لیکن وار الٹا پڑ گیا۔ سنجے لیلا بھنسالی نے پیسہ تو کما لیا لیکن عوامی املاک کا بے حد نقصان ہوا۔ ایسی بے تکی، بے مقصد تاریخی فلموں پر امتناع عاید ہونا چاہیے جو دلوں میں نفرت جگاتی ہیں تا کہ ملک کا امن برقرار رہے۔

مشہور شاعر ساقی فاروقی، محمد علوی اور نامور افسانہ نگار قدیر زماں کا انتقال ہوگا۔ ادارہ مرحومین کے لیے دعا گو ہے اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ''یادیں'' شامل نہیں کی جا رہی ہیں اگلے مہینے سے یہ سلسلہ جاری کیا جائے گا۔ مشمولات کے بارے میں اپنی رائے سے نوازیں۔

بیگ احساس

سلام بن رزاق

افسانہ

بٹوارہ

وہ دو بھائی تھے ایک ہی عورت کی کوکھ سے جنم لینے والے دو حقیقی بھائی۔ وہ دونوں اپنی ماں سے یکساں شدّت سے پیار کرتے تھے۔ اُنھیں اپنی ماں کی پاکیزگی اور وسیع المشربی پر بے حد ناز تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کی عظمت کے گیت گایا کرتے۔ وہ اپنی ماں کو دنیا کی سب سے زیادہ پاکباز اور نیک خاتون سمجھتے تھے، اُس کی خدمت ہی کو اپنا دین اور ایمان جانتے۔ اُنھیں ہمیشہ اس بات کی فکر ستایا کرتی تھی کہ کہیں ماں کی خدمت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ وہ دنیا بھر کی ساری خوشیاں اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتے تھے، اور ویسا کرنے کی اُنھوں نے کوشش کی بھی۔ اُنھوں نے ماں کے رہنے کے لیے ایک عالیشان کوٹھی بنوادی، کوٹھی کے اِردگرد ایک طویل وعریض پائیں باغ بنوادیا۔ باغ میں مختلف قسم کے درخت اور پھولوں کے پودے لگوادیئے۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت حوض اور رنگین پانی کے فوّارے نصب کروادیئے۔ خدمت کے لیے ہمہ وقت نوکر اور باندیاں کمربستہ رہتیں۔ بوڑھی ماں بھی اپنے جوان بیٹوں کی یہ خدمت گزاری اور سعادت مندی دیکھ دیکھ کر پھولی نہ سماتی۔ سچ مچ وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھی، وہ جانتی تھی کہ اُس کے ایک اشارے پر اُس کے بیٹے اُس کے لیے آسمان کے تارے تک توڑ کر لا سکتے ہیں۔

دونوں بھائی بستی میں سب سے زیادہ خوبصورت، جوان اور طاقتور سمجھے جاتے تھے ساری بستی پر دونوں کی دھاک تھی، کسی دشمن کی مجال نہیں تھی کہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اُن کی نیک نامی کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی، اور دوسری بستیوں کے بڑے بڑے لوگ اُن سے ملاقات کرنے کے متمنّی رہا کرتے۔ وہ اسی طرح بڑی شان وشوکت سے زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کی ماں بھی بیٹوں کی اس باوقار زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ دن بیت رہے تھے، اچانک ماں نے بیٹوں کے رویّے میں کچھ تبدیلی محسوس کی۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ اُس کے بیٹے گھر میں بظاہر جتنے متین اور پُرسکون نظر آتے ہیں، اصل میں باہر وہ ویسے نہیں ہیں۔ پہلے پہل اُسے صرف شبہہ تھا، مگر دھیرے دھیرے اُس کا شبہ یقین میں بدلتا گیا۔ وہ چپکے چپکے ان کی باہری سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ اس کی مخصوص باندیوں اور خاص ملازموں نے بیٹوں کے بارے میں جو اطلاعات دیں، اُنھیں سُن کر وہ فکرمند اور اُداس ہوگئی۔ اُسے بے حد دُکھ ہوا کہ اُس کے بیٹے اصل میں ویسے نہیں ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس کے سامنے جتنے سعادت مند، رحم دل اور نرم مزاج دکھائی دیتے ہیں، اُس کے پیچھے وہ اُتنے ہی سرکش، سفّاک اور تُند خُو ہیں۔ اُس نے اُنھیں خلوص، محبت، انسان دوستی اور ایثار وقربانی کا درس دیا تھا۔ مگر اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی ساری ہدایات کو پسِ پشت ڈال کر اپنے خودساختہ اُصولوں کے غلام بن گئے تھے۔ جب وہ اس کے سامنے ہوتے تو بظاہر ایک اور نیک نظر آتے، مگر گھر سے باہر نکلتے ہی دونوں کے راستے جدا ہوجاتے، دونوں ایک دوسرے کے کٹّر دشمن بن جاتے۔ باہر ہر ایک کے مصاحبوں اور ہمنواؤں کا الگ الگ گروہ تھا، وہ سب دن رات سر جوڑ کر اپنے اپنے حریف کو زَک پہنچانے کی ترکیبیں سوچا کرتے۔ ایک دوسرے کے خلاف زہر اُگلنے والی تقریریں کرتے اور مضامین لکھتے۔ سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں پر ایک دوسرے کے

نظریات کے خلاف زہریلا پروپگنڈہ کرتے۔سبھاؤں اور جلوسوں میں ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگاتے، گالیاں دیتے اور جی کھول کر بُرا بھلا کہتے۔اب وہ بوڑھی اور نیک عورت بہت زیادہ دُکھی رہنے لگی۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس کے بیٹوں کو کیا ہوگیا ہے۔اس سے اُن کی تربیت اور پرورش میں ایسی کون سی لغزش ہوگئی تھی کہ وہ دونوں اِس قدر گمراہ ہوگئے تھے۔اُس کے دودھ میں ایسا کون سا زہر گھُل گیا تھا کہ اب وہ دونوں زہریلے ناگوں کی طرح ایک دوسرے پر پھنکارنے لگے تھے۔اُس نے بہت غور کیا، بہت سوچا، مگر اُسے کہیں بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی غفلت دکھائی نہ دی۔اُس نے دونوں کو اچھا انسان بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔اُس نے سوچا، وہ اپنے بیٹوں کو سمجھائے گی۔وہ لوگ اب بھی اُس کا احترام کرتے ہیں۔یقیناً اس کے حکم کو نہیں ٹالیں گے۔آخر اُس کی چھاتیوں کا دودھ ان کی رگوں میں خون بن کر دَوڑ رہا ہے۔وہ اس کے حکم کے خلاف کیو ں کر جاسکتے ہیں۔یہ سوچ کر اس نے ایک دن دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بُلایا، پیار سے اُن کے ماتھے چومے اور کہنے لگی ''میرے لاڈلو! تم دونوں میری آنکھوں کا نور ہو، میرے دست و بازو ہو، مجھے تم دونوں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ مجھے تمہاری نیک چلنی، ذہانت، اور قوّت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں مجھے بے حد چاہتے ہو، میرے لیے اپنی جان تک قربان کرسکتے ہو، مگر.....اتنا کہہ کر وہ دُکھی خاتون ایک لمحے کے لیے رُک گئی، اُس نے اپنی بوڑھی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔اُس کے دونوں بیٹے گردن جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔پتھر کے مجسّمے کی طرح سخت اور بے حِس، اُن کے چہرے اُس وقت سارے احساسات سے عاری تھے۔یہ بے حِسی دیکھ کر اُس نیک عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اُس نے بھرّائے گلے سے کہا۔

''میرے جگر کے ٹکڑو! آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے، نہ تمھارے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کے پھول کھِل رہے ہیں، نہ آنکھوں سے پیار اور محبت کا رس ٹپک رہا ہے۔تم لوگ اچانک اتنے کٹھور کیوں ہوگئے ہو؟''

دونو ں بیٹوں نے دھیرے دھیرے نظریں اُوپر اُٹھائیں، ماں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے اُن کی آنکھوں میں نرمی اور پیار کی جھلکیاں دکھائی دیں، پھر دونوں نے گردنیں موڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔اور دوسرے ہی لمحے اُن کے چہروں پر چھائی ہوئی ملائمت یکلخت غائب ہوگئی اور آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

تب پہلے نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا ''ماں آج بھی تم پر میری جان قربان ہے، آج بھی تمھارے چرنوں کی دھول سے میں اپنے ماتھے پر تلک لگاتا ہوں، مگر ماں.....؟''

اُس نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ میرا دشمن ہے، میرا جانی دشمن، میرا اس کے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا۔اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

نیک عورت نے گھبرا کر اپہلے کی طرف دیکھا، پھر اُس نے دوسرے بیٹے پر نظر ڈالی، دوسرے نے پہلے کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا ''ماں تمھارے قدموں تلے میری جنّت ہے،۔میں تمھارے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا سکتا ہوں، مگر میں اپنے اِس دشمن کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔یہ میرے وجود کو پیس کر رکھ دینا چاہتا ہے۔یہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔''

اب نیک عورت بالکل ہی سِٹپٹا گئی تھی۔اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہتے رہے، وہ تھوڑی دیر تک اِسی طرح روتی رہی، پھر اپنے لہجہ کو انتہائی نرم بناتی ہوئی بولی۔

''مگر میرے جگر پارو! آخر ایسی کون سی بات ہوگئی جس کے لیے تم

دونوں ایک دوسرے سے اس قدر ناراض ہو؟''

پہلے نے اُسی سخت لہجے میں کہا ''ماں اب اُن سب باتوں کو دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ، میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کے اور میرے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔اب اس گھر میں یا تو یہ رہ سکتا ہے یا میں، آج سے ہم دونوں ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

دوسرے نے بھی اُسی کڑے لہجے میں کہا ''ہاں ماں! آج تمھیں بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم اس کے ساتھ رہو گی یا میرے ساتھ۔کیوں کہ یہ میرا دشمن ہے اور میں اس دشمن کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔''

بے چاری نیک خاتون اِس دوطرفہ غم کی چوٹوں سے نِڈھال ہوگئی،اُس نے اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ وہ دونوں کی ماں ہے،وہ دونوں ہی اس کے بیٹے ہیں۔انھیں اِس طرح سے ایک دوسرے کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔مگر اُن پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔وہ اپنی بات پر اَڑے رہے، وہ نیک عورت انھیں سمجھاتی رہی۔سمجھاتے سمجھاتے اُس کا گلا رُندھ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور سارا جسم ربڑ کی طرح تن گیا،وہ بے جان ہوکر فرش پر لڑھک گئی۔دونوں بیٹے گھبرا کر اُس کے پاس بیٹھ گئے ۔پہلے نے نبض دیکھی،نبض بند ہوچکی تھی۔دوسرے نے منہ کے پاس ہتھیلی رکھی،سانس پہلے ہی رُک گئی تھی،دونوں کچھ دیر تک اُسی طرح ماں کے سرہانے بیٹھے رہے۔دونوں کے چہرے دُکھ اور غم سے پیلے پڑ گئے تھے۔دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر ماں کی لاش کو بھگو رہے تھے۔وہ لوگ بہت دیر تک اِسی طرح بیٹھے روتے رہے۔تھوڑی دیر بعد اچانک دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔دونوں کے بہتے آنسو ایک دم رُک گئے۔اُنھوں نے دوبارہ اپنے چہروں کو سخت بنالیا۔آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ مُٹھیاں بھینچ گئیں،منہ سے کف جاری ہوگیا۔پہلا کسی سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا بولا۔ ''غدّار،حرام خور،!نکل جا یہاں سے،نکل جا،اب اپنے ناپاک ہاتھ لگا کر ماں کی لاش کو گندہ مت کر، چلا جا ،چلا جا۔''

دوسرے نے بھی اُسی طرح اکڑتے ہوئے جواب دیا ''خودغرض کُتّے ،تو خود نکل جا یہاں سے، یہ میری ماں ہے۔اب اس پر تیرا کوئی حق نہیں ہے۔''

پہلا بولا ''ارے جا ناپاک کتّے میں اس پوتّر لاش پر تیرا سایہ تک پڑنے نہیں دوں گا،میں اپنی ماں کو چندن کی لکڑی میں جلاؤں گا،اور اس کی راکھ سے اپنے ماتھے پر تلک کروں گا۔''

دوسرا مارے غصّے کے سُرخ ہوچکا تھا ، پوری قوّت سے گرج کر بولا۔ ''تو ایسا نہیں کرسکتا،میں تجھے اس لاش کی بے حرمتی کرنے نہیں دوں گا۔میں اس مقدّس لاش کو پورے عزم واحترام کے ساتھ دفن کروں گا،میں اپنی ماں کی قبر پر ایک بہت عالیشان مقبرہ بناؤں گا اور اس پر ایک کتبہ کندہ کراؤں گا،یہ دنیا کی مقدّس ترین ہستی کی قبر ہے۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

''تم بھی ویسا نہیں کرسکتے۔''

''میں اِسے جلاؤں گا۔''

''میں اِسے دفن کروں گا۔''

پھر دونوں ایک دوسرے پر بل پڑے ،اپنی ساری قوّت صرف کرکے دونوں ایک دوسرے کو مار ڈالنا چاہتے تھے۔لڑتے لڑتے دونوں زخموں سے چور ہوگئے ،زخموں سے خون ٹپکنے لگا،آخر دونوں نِڈھال ہوکر فرش پر گر پڑے،دونوں لاش کے دائیں بائیں پڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے تھوڑے وقفہ کے بعد دونوں پھر اُٹھے،مگر اب اُن میں لڑنے کی سکت باقی نہ تھی۔

پہلے نے کہا '' چلو ہم کسی تیسرے آدمی سے اپنے

مقدمے کا فیصلہ کرائیں، دوسرا بھی راضی ہوگیا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکلے، اُن کے زخموں سے اب بھی خون رِس رہا تھا اور کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں بدن پر جھول رہے تھے، اُنھوں نے باہر نکل کر دُور تک نظر دوڑائی، سڑک سنسان تھی۔ دونوں بے چینی سے کسی تیسرے آدمی کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر دور سے ایک اجنبی آتا دکھائی دیا۔ دھیرے دھیرے اجنبی قریب آتا گیا، جب وہ بالکل قریب آ گیا تو دونوں لپک کر اس کے پاس پہنچے، اجنبی دونوں کو اس بگڑے حلیئے میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ مگر دونوں نے اس کے پیر پکڑ لیے اور اُس سے گڑگڑا کر کہا ''ہمیں اس مشکل سے نجات دلاؤ ہم تمھیں منصف بناتے ہیں۔''

دونوں گھسیٹ کر اُسے اپنے گھر لے آئے پھر پہلے نے نیک عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ میری ماں ہے، میں اِسے اپنے اُصولوں کے مطابق جلا کر اِس کی راکھ سے ماتھے پر تلک کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسرے نے کہا ''نہیں یہ میری ماں ہے، میں اِسے دفن کر کے اس کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنانا چاہتا ہوں۔''

اجنبی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، اس نے کہا ''یہ تم دونوں کی ماں ہے، تم دونوں بھائی بھائی ہو پھر دونوں مل کر اس کا کِریا کرم کیوں نہیں کرتے۔''

پہلے نے کہا ''نہیں یہ میرا بھائی نہیں ہے، البتہ یہ میری ماں ہے۔''

دوسرے نے کہا ''نہیں یہ جھوٹا ہے،، یہ میری ماں ہے اور یہ میرا دشمن ہے۔

اجنبی نے دونوں کو غور سے دیکھا، اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک چالاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' تم دونوں بیوقوف ہو، اتنی آسان بات تمھاری سمجھ میں نہ آئی۔'' دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

اجنبی نے آگے کہا ''تم لوگ اس لاش کو دو حصوں میں تقسیم کرلو، اور اپنی اپنی رسم کے مطابق اس کا کِریا کرم کرڈالو۔''

اتنا کہہ کر اجنبی گھر سے باہر نکل گیا، اور دونوں چپ چاپ کھڑے لاش کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک اجنبی کے فیصلے پر غور کرتے رہے۔ پھر دونوں نے کہیں سے ایک آری لی اور لاش کو درمیان سے چیر دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے حصّے کی لاش کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اب دونوں مطمئن تھے، مگر ان کا یہ اطمینان زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا، دونوں نے دیکھا کہ لاش کے کٹے ہوئے حصّوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ سُرخ اور گرم گرم خون کے زندہ قطرے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن قطروں نے لاتعداد انسانوں کی شکلیں اختیار کرلیں، اور وہ نوزائیدہ انسان ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سب شکل وصورت کے اعتبار سے انسان نظر آرہے تھے، مگر بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ دونوں بھائی حیرت اور خوف سے تھرتھر کانپتے ہوئے کمرے کے ایک کونے میں دبک گئے۔ لاش سے برابر قطرے ٹپک رہے تھے۔ قطروں سے نئے نئے انسان جنم لے رہے تھے، اور پھر ایک دوسرے کو قتل کردیتے تھے۔ صبح سے شام ہوگئی، شام سے پھر صبح ہوگئی۔ دن مہینے اور سال بیت گئے، مگر قتل وخون کا یہ بھیانک سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اب وہ دونوں بھائی بوڑھے ہوگئے ہیں۔ پچھتاوے، غم اور افسوس سے اُن کی کمریں جھک گئی ہیں۔ چہروں پر جھرّیاں پڑگئی ہیں۔ وہ آج بھی کمرے کے کونوں میں دُبکے ہوئے اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں سے اس انوکھی لڑائی میں مرنے والوں کی لاشیں گنتے رہتے ہیں۔ لاشوں کے اعداد وشمار جوڑنے کے سوا اب اُن کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔

OOO

نور الحسنین

افسانہ

شراتری تو..... شراتری تو

آج بھی وہی خبریں تھیں۔ بوڑھے غفور شاہ نے اخبار کو آنکھوں کے سامنے سے ہٹایا اور کان سے چشمے کی ڈوری کا پیچ کھول کر اُسے محراب میں رکھ دیا تو سامنے بیٹھے ہوئے شفیع ڈار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اُس نے تعجب سے اُن کی طرف دیکھا ،'' آز بوز نا ایوانہ کھبری ؟'' (کیا آج خبریں نہیں سنائیں گے؟)

'' کیا سناؤں۔۔۔ ہر روز ایک جیسی ہی خبریں آتی ہیں، اُتر میں بسے شہر میں فساد ہو گیا، ہماری وادی سے قریب کے شہر میں چلتی ٹرین میں ایک لڑکی کی آبرو لوٹی گئی، ملک کے چار غدار پکڑے گئے جن کا تعلق برسرِ اقتدار پارٹی سے ہے ۔ دیگر ریاستوں میں موجود دیہاتوں میں کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ رہی ہماری ریاست کی بات تو وہی سب کچھ ہے، یعنی ہو رہا کچھ اور ہے اور میڈیا لکھ رہا کچھ اور ہے'' اُنھوں نے اخبار کو غصے سے چولا مولا کر کے دروازے سے باہر پھینک دیا،'' شفیع ڈار آج سے میں اب اخبار بھی نہیں پڑھوں گا۔''

'' تو ہے چھو برنو کالے ٹی۔ وی واچُن ترمت۔''

(آپ نے پہلے ہی ٹی۔ وی دیکھنا بھی بند کر دیا۔)

'' ہاں ۔۔۔!'' غفور شاہ نے ایک لمبی سانس لی ،

''اُس میں بھی کیا دکھایا جاتا ہے ؟ پروپیگنڈہ۔۔۔ جھوٹے اشتہارات ۔۔۔ اور وزراء کے غیر ملکی سفر کی تفصیلات ۔۔۔ یا پھر کسی بے بنیاد خبر کی اسٹوڈیو میں بنائی گئی جھوٹی جھلکیاں ۔۔۔'' وہ زمین کو گھورنے لگے ،'' کیا ریاست تھی ہماری ، جنت نشان ، زعفران کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی، تا حدِ نظر سبز مخملیں دوب، اور اُس پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے، جیسے سفید سفید پھول مسکرا رہے ہوں، بادام کی ڈالیوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کی مانند جھلملا رہے ہوں، جھیلوں میں خوب صورت شکارے ڈولتے ہوئے ، پیار و محبت کے نغمے گنگناتی لڑکیاں، دکھ درد میں ساتھ اُٹھتے قدم ،بھیڑوں کی آوازوں سے گونجتی وادیاں، تب بندوقوں سے گولیوں نہیں جروالو کے پیڑوں پر پھول کھلتے تھے ۔۔۔ آہ۔۔۔ اب تو یہ سب جیسے ایک خواب ہی ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔، اُنھوں نے جھکی ہوئی گردن اُٹھائی، شفیع ڈار کی طرف دیکھا،'' بھائی روز روز ایک جیسی خبروں کو کیا پڑھنا، اب تو بنا اخبار پڑھے بھی میں بتا سکتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے، اور تمہارے دماغ میں بھی وہ سب کچھ روشن ہو جائے گا جو میں نے کہا بھی نہیں۔''

'' لیکن کب تک ایسا ہوتا رہے گا ؟'' شفیع ڈار نے افسوس بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا ،'' کبھی شک میں گرفتاریاں، آئے دن بند کا اعلان ، کبھی انکاونٹر ، کبھی گھروں کی تلاشیاں، اسکول کالج بند، ہم لوگ تو دوہری مصیبتوں کے شکار ہیں ۔ وہ بھی ہم پر ہی بندوق اُٹھاتے ہیں اور یہ بھی ، کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ایسے حالات میں ہم کیسے جی رہے ہیں۔ بستی میں روزگار کی کوئی سہولت نہیں ۔ اور ۔۔۔۔'' ابھی وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ ٹھیک اُسی وقت گھبرائی ہوئی غفور شاہ کی بیٹی زور سے دروازے کو کھولتی ہوئی داخل ہوئی، اور اُس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔

'' کیا ہوا ریشم ۔۔۔؟ اس قدر گھبرائی سی کیوں ہے؟ '' بیٹھک میں سے غفور شاہ کی آواز اُبھری اور دونوں بوڑھے اُسے

حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

اُس کی سانسیں اُسی طرح چل رہی تھیں۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، گویا اپنی سانسوں پر قابو پانا چاہتی تھی، اُس نے آنکھیں بند کر لیں، تو دماغ میں وہی منظر اُبھر آیا۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑی قدرتی مناظر کا لطف اُٹھا رہی تھی۔ تا حدِ نظر پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا، سورج کی کرنوں کی وجہ سے وہ رنگ برنگے محسوس ہو رہے تھے، اُن کے اوپر برف کی جیسے گوٹ ٹکی ہوئی تھی شاہ بلوط کے اونچے اونچے درخت برف کے ہیرے موتیوں سے سجے ہوئے تھے، بیچ بیچ میں چنار کے درختوں کے بڑے بڑے پتوں پر سورج کی کرنیں ناچ رہی تھی۔ اُن کے بالکل پائنتی ندی ،گنگناتے ہوئے بہہ رہی تھی۔ دور پلیا کو گود میں اُٹھائے کچی پکی سڑک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اُسی وقت اُس نے کالی بیری اور اُودی بیری کی گھنی جھاڑیوں میں کسی کی ہلچل کو محسوس کیا تھا، خوف کسی بجلی کی طرح اُس کے پورجسم دوڑ گیا اور بے ساختہ اس کی نظریں پلیا کی طرف اُٹھیں اور وہ بے تحاشہ بلندی سے ترائی کی طرف دوڑی تب ہی قریب کے اناروں کے باغ سے لال تاج اور لاجوردی پروں والے پرندے نے اُڑان بھری۔۔۔شُراتری تو ں۔۔شراتری توں۔۔۔کی آوازوں سے جنگل گونج اُٹھا، اور ریشم کو محسوس ہوا گویا وہ آگاہ کر رہا ہو کہ۔۔۔ذرا اپنی فکر کرتو۔۔۔ذرا اپنی فکر کرتو۔۔۔۔

اور وہ کسی طرح گھر پہنچ گئی، اُس نے آنکھیں کھولیں اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی بیٹھک میں قدم رکھا ہی تھا کہ کہنا شروع کیا، ''بابا اس طرف ملٹری کی لاریاں آ رہی ہیں۔''

غفور شاہ نے بیٹی کی طرف لاپرواہی سے دیکھا، ''بیٹی یہ اب نئی بات تو رہی نہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھے، ''پتہ نہیں کیا مصیبت آنے والی ہے '' انھوں نے شفیع ڈار کی جانب دیکھا، ''بھائی تم بھی اپنے گھر کی راہ لو۔۔۔'' ایک لمبی سانس اُن کے منہ سے نکلی، '' اب تو ان باتوں کے عادی ہو چکے ہیں۔'' وہ ریشم کی طرف متوجہ ہوئے اور اُس کی زبان سے نکلا، ''بابا۔۔۔بات صرف ملٹری کی لاریوں کی نہیں ہے۔''

غفور شاہ کی آنکھیں تن گئیں اور اُنھوں نے آنکھوں ہی سے سوال کیا تو وہ بتانے لگی، '' میں نے اُدھر گھنی جھاڑیوں میں کسی کو دیکھا ہے۔ میں ڈھلان سے شاہ بلوط اور ساگوانوں کے درختوں کے بیچ سے دوڑتے ہوئے یہاں تک کیسے پہنچی میرا دل ہی جانتا ہے۔۔۔'' اچانک اس کی نگاہیں دروازے پر پڑیں، '' چاچا کب چلے گئے۔۔۔؟ ''

باپ کے جواب کا انتظار کیے بنا وہ دروازے کی طرف لپکی اور دروازہ بند ہی کر رہی تھی کہ کسی نے پوری طاقت سے دروازے کے پٹوں کو اندر کی جانب دھکیلا اور وہ نیچے گر پڑی اور تکلیف سے بھری ہوئی ایک کراہ اُس کے منہ سے بلند ہوئی۔ غفور شاہ نے جیسے ہی قدم بیٹی کی طرف بڑھایا، دروازے سے ایک مشین گن بردار نوجوان داخل ہوا، اور اُس نے پھرتی سے دروازے کو بند کیا اور باپ بیٹی کی طرف گن کی نال اُٹھاتے ہوئے حکم دیا، ''اپنی زبان بند رکھو۔۔۔ میں تو مارا ہی جاؤں گا۔۔۔لیکن اس سے پہلے تمھیں بھی ۔۔۔'' وہ دونوں ہی خوف زدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ غفور شاہ نے بیٹی کو کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا۔ نوجوان نے پھر ایک بار اُنھیں بندوق کی نال سے اشارہ کیا کہ وہ بیٹھک کی طرف چلیں۔

اور پھر وہ دونوں کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔۔۔۔

غفور شاہ کا مکان پہاڑی کے دامن میں ایک اونچے سے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی صحن میں خوب صورت پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ اُن کے پیچھے سیب کے

کچھ درخت تھے۔چھوٹی سی راہداری کے سامنے لکڑی کی سیڑھیاں تھیں جو آنے والے کو بیٹھک میں پہنچاتی تھیں۔بیٹھک بہت زیادہ کشادہ نہیں تھی۔اُس میں ایک پرانی قالین بچھی تھی دیواروں پر تغرے آویزاں تھے۔

شمال کی جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔جس کے سامنے کھڑے رہ کر نیچے پھیلی ہوئی بستی کو دیکھا جا سکتا تھا۔بیٹھک کا اندورونی دروازہ مکان کے دوسرے حصوں میں لے جاتا تھا اور مکان کے آخر حصے میں بھی صحن تھا جس میں کچھ درخت تھے اور دیوار کے پیچھے ٹیکڑی تھی جو گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور دور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔

بیٹھک میں پہنچتے ہی اُس نے غفور شاہ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دھکا دیا، وہ گرتے گرتے بچے۔ریشم نے اُسے غصے سے گھور کر دیکھا تو اُس کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔وہ اُس سے دو قدم دور ہٹی،'' بہن تو رہی ہو گی تم کو بھی۔''

اُس نے نظریں جھکا لیں،'' میں ماں باپ بہن بھائی سب کو بھول کر اپنی لڑائی لڑ رہا ہوں۔'' اُس نے گردن اُٹھائی،'' لیکن تمہارے جیسے لوگ جو اپنے بے بس راجا کی خواہش کو بھول کر صرف اپنی زندگی چاہتے ہیں ہمارے جیسے اُن کے لیے موت کا پیغام ہیں۔'' اُس نے پھر ایک بار گن کی نال غفور شاہ کی طرف کر دی،لیکن اس بار غفور شاہ کے چہرے پر دور دور تک خوف نہیں تھا ،'' تو پھر راجا نے الحاق نامہ پر دستخط کیوں کر دیا تھا۔۔۔؟''

اُس کی آنکھیں غفور شاہ کو گھورنے لگیں،اُس نے مشین گن کا دستہ تپائی پر رکھا'' ہمارے راجا ہری سنگھ نے برٹش حکومت کے نام ایک مراسلہ بھی بھیجا تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور دونوں ملکوں سے اچھے تعلقات رکھنے کے خواہاں ہیں،لیکن ایک طرف مغبوضہ وادی کی آڑ میں فوجی لشکر آگے بڑھنے کو بے تاب تھا تو دوسری طرف ہندوستانی لشکر۔۔۔ وادی تباہ و برباد ہو جاتی۔۔۔''

'' تباہ و برباد تو اب بھی ہو رہی ہے۔۔۔'' غفور شاہ نے شمالی سمت کی کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا،غربت میں ڈوبے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات،جن کی اینٹ اینٹ سے جھانکتا ہوا افلاس آسمان کی طرف دعاؤں کی صورت دیکھ رہا تھا،معاشی بدحالی، بے روزگاری،غربت،تعلیمی پسماندگی، بے سکونی، بدنظمی، اقتصادی پستی،قدرتی آفات،حتیٰ کہ باڑھ کا بھی مقابلہ کرنے کی سکت نہیں،اُن کی آنکھوں میں ایک کے بعد ایک جانے کتنے منظر گردش کرنے لگے تھے،'' کیا تم کو گلی گلی گولیوں کی گونج،لاٹھیاں کھاتی لڑکیاں،عورتیں، بچے، مرد دکھائی نہیں دیتے؟ سڑکوں پر ہیبتناک سناٹے، بازاروں میں خاموشی،تعلیمی اداروں پر قفل نظر نہیں آتے؟۔۔۔راجا کا خواب آنکھوں میں لیے پھرنے سے تعبیر نہیں مل جاتی۔۔۔؟ ''

'' جانتے ہیں ہم بھی۔۔۔اس خواب کی تعبیر قربانیوں اور خون بہانے کے بعد ہی ملے گی۔۔۔''

'' کوئی گھر بچا ہے۔۔۔؟'' غفور شاہ نے اپنا چہرا دیوار کی طرف کر لیا،'' بوڑھی ہڈیاں رہ گئیں ہیں ۔۔۔ جوان بیٹا جھوٹے انکاؤنٹر کی نذر ہو گیا۔۔۔ بڑھاپا رہ گیا۔۔۔بوڑھاپے کا سہارا چلا گیا۔۔۔اور اب مجھے پورا یقین ہے۔۔۔'' وہ تیزی سے نوجوان کی طرف پلٹے،''اپنے تحفظ کی خاطر یا تم ہمیں مار دو گے یا پھر تمہاری تلاش میں آنے والے سپاہی۔۔۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا،لیکن اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا ، اُس نے اپنی بندوق کو اُٹھایا اور بیٹھک کے دروازے سے مکان کے دیگر حصے کا جائزہ لینے کے لیے اندر چلا گیا ۔غفور شاہ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔خوف اب بھی اُس کے چہرے

پرعیاں تھا،لیکن اُس کی زبان سے نکلا،''بابا۔۔۔ اُس کا طریقہ صحیح ہے یا غلط۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔۔۔لیکن پوری وادی کے نوجوان یہی سوچتے ہیں۔خود میں بھی۔۔۔''

غفور شاہ نے بیٹی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا، اُنھوں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اُن سے کوئی کہہ رہا، باغ کی حفاظت کے لیے لگائی گئی باڑ ہی ہی پھول پودوں کو کاٹنے لگے تو پھول پودے کیا کریں گے؟

پتہ نہیں وہ دونوں کب تک اُسی طرح بیٹھک میں دم سادھے بیٹھے رہے۔ دونوں کی زبانیں خاموش تھیں اور آسمان پر پرندوں کے جھنڈ گردش کر رہے تھے۔آخر کچھ سوچ کر ریشم بیٹھک سے اُٹھ کر اندر گئی تو اُس نے دیکھا صحن میں موجود درخت کے موٹے سے تنے کا سہارا لے کر وہ دیوار سے پرے جھانک رہا تھا۔مشین گن اُس کی پیٹھ پر جھول رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے جیسے ہی نیچے اُترا، اُس کے کانوں میں سرود کے تار جھنجھنا اُٹھے،'' پتہ نہیں تم نے کب کھانا کھایا ہوگا۔''

اُس نے پلٹ کر دیکھا تو ریشم باورچی خانے کی طرف جارہی تھی۔وہ اُس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھانے لگا

ریشم نے دسترخوان پر کاشور سے بھری پلیٹ،سلاد، پانی کی صراحی اور گلاس رکھ دیا،اور جونہی جانے کے لیے پلٹی نوجوان نے آہستہ سے کہا،''میرے مشن نے سارے رشتے توڑ دیئے تھے لیکن آج میں نے جانا قومی رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے۔'' وہ دستر پر بیٹھ گیا۔

ریشم نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر غفور شاہ کے پاس چلی آئی۔وہ کھڑکی سے لگے بستی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک عجیب سا وحشت ناک سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا ،اور وہ منہ ہی منہ میں پانچوں کلموں کو یکے بعد دیگرے پڑھ رہے تھے۔وہ بھی باپ کے کندھے کے پیچھے سے بستی کو دیکھ رہی تھی۔ درخت خاموش کھڑے تھے اور اُن کی ٹہنیوں پر بیٹھے لال تاج اور لاجوردی پروں والے پرندے شور مچا رہے تھے۔۔۔شراتری تو۔۔شراتری تو ۔۔۔شری تری تو۔۔۔۔۔۔۔

اچانک باہری دروازے پر اتنی زور سے ضرب پڑی کے وہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔غفور شاہ تیزی سے بیٹھک کے دروازے پر پہنچے، اُنھوں نے دوازے کے چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔وردی پوش ہاتھوں میں گن لیے تیزی سے اندر داخل ہوئے ۔پرندوں کا شور ایک دم بلند ہوا۔۔۔شراتری تو۔شراتری تو۔۔شرا تری تو۔۔۔شراتری تو۔۔۔۔۔

''کہاں چھپایا ہے اُس غدار کو؟'' ایک گرج دار آواز اُبھری۔

گھبراہٹ کے مارے غفور شاہ کے زبان بند تھی۔

'' اسے ہماری زبان میں نہیں، بندوق کی زبان سے پوچھنا ہوگا۔'' اور پھر کئی گولیاں غفور شاہ کے سینے کو چیرتے ہوئے نکل گئیں۔اُن کی چیخ کے ساتھ ہی ریشم اور پرندوں کے شور سے آسمان گونج اُٹھا۔۔شراتری تو۔شراتری تو۔۔شراتری تو۔۔۔

وردی پوش تیزی سے مکان میں داخل ہوئے، اُنھوں نے مکان کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا، لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا، اور جب وہ واپس ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا ریشم باپ کی لاش سے چمٹی بے اختیار رو رہی تھی۔ وردی والوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا،آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔وہ اُسی طرح باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی تھی۔۔۔۔

شراتری تو۔شراتری تو۔۔شراتری تو۔۔۔۔ پرندوں کی یہ آوازیں آسمان میں گونج رہی تھیں۔

OOO

مجتبیٰ حسین

خاکہ

قدیر زماں

قدیر زماں ہمارے لگ بھگ نصف صدی پرانے دوست ہیں۔ 1953ء میں ہمارے دوست وہاب عندلیب نے کچھ احباب کے ساتھ مل کر کاچی گوڑہ میں ایک گلبرگہ کاٹیج قائم کیا تھا جہاں گلبرگہ سے آنے والے طلبہ امداد باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کاٹیج کو چلایا کرتے تھے۔ اس امداد باہمی میں ہمارا حصہ ''امداد'' میں کم اور ''باہمی'' میں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کاٹیج میں سبھی گلبرگہ کے طلبہ رہتے تھے لیکن قدیر زماں غالباً اکیلے ایسے طالب علم تھے جن کا تعلق کریم نگر سے تھا۔ گلبرگہ میں کریم نگر کی اس ملاوٹ کے خلاف جب ہم احتجاج کرتے تھے تو وہاب عندلیب اپنی روشن خیالی اور وسیع المشربی کو ثابت کرنے کیلئے اقلیتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے مسئلہ پر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا کرتے تھے۔ گلبرگہ کے طلباء کی اکثریت کے درمیان وہ قدیر زماں کو کریم نگر کی اقلیت سمجھتے تھے اور جی جان سے ان کا تحفظ کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ قدیر زماں شروع سے ہی ہم سے بدکتے رہتے ہیں اور ماشاءاللہ اتنی پرانی دوستی کے باوجود آج بھی بدکتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو ان کا شمار ہمارے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد اب دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی لئے وہ ہمیں عزیز بھی ہیں۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک شعر ہے۔

وہ بُرے ہوں کہ بھلے جو بھی ہمیں پیارے ہیں
اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

کسی پتھر پر پانی کے قطروں کے گرنے کا عمل لگاتار جاری رہے تو پتھر بھی گھسنے لگ جاتا ہے۔ اس مثال میں ہماری حیثیت پتھر کی سی اور قدیر زماں کی حیثیت پانی کے قطروں کی سی ہے۔ غرض قدیر زماں سے اپنے دیرینہ مراسم کو بیان کرنے کیلئے ایک دفتر چاہئے اور اس دفتر کو ہم پھر کبھی کھولیں گے۔ یوں بھی پنڈورا کے باکس کو کھولنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آج ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی کہ پچھلے دنوں ہمیں ان کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب ملی ہے جس کا عنوان "BRIBERY" ہے۔ اس کتاب کو پاکر ہمیں سب سے پہلے خوشی تو یہ حاصل ہوئی کہ قدیر زماں اب اردو کے بجائے انگریزی میں لکھنے لگے ہیں۔ ماشاءاللہ وہ تو اتنی اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں کہ وہ انگریزی ادب کے ''شمس العلماء'' اور ''لسان العصر'' وغیرہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ یہ تو ان کا کرم ہے کہ اتنی اچھی انگریزی جاننے کے باوجود اتنے برس تک خواہ مخواہ ہی اردو جیسی پسماندہ زبان میں اپنا وقت برباد کرتے رہے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو کب کے اردو سے جاچکے ہوتے اور اردو والے ہمیں صدائیں دیتے رہ جاتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انگریز اپنے آپ ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر نہ گئے ہوتے تو قدیر زماں کی انگریزی کو پڑھ کر ضرور چلے جاتے کہ میاں اب اس ملک میں ہمارا کیا کام۔ سنبھالو ہماری زبان اور اپنا راج پاٹھ۔ غرض قدیر زماں کو چونکہ اپنے بیان کیلئے کچھ اور وسعت چاہئے تھی تو وہ انگریزی ادب میں چلے گئے۔ یوں بھی زبان تو اظہار کا ایک ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ قدیر زماں کی خوبی یہ ہے کہ سماج میں جب بھی کوئی بُرائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف آواز ضرور اُٹھاتے ہیں اور اس وقت تک آواز اٹھاتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ خود اس بُرائی کا حصہ نہ بن جائیں۔ چنانچہ ان کی زیرنظر کتاب اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے ۔ قدیر زماں نے اس کتاب میں ''رشوت ستانی'' کے خلاف بڑے

زور وشور سے آواز اُٹھائی ہے اور ان رشوتوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف افراد کو دیں بلکہ یہ تک تسلیم کیا ہے کہ آج وہ جو کچھ ہیں رشوت دینے کی وجہ سے ہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 1951ء میں کلکٹر کریم نگر کے دفتر میں ایک عہدیدار کو پچاس روپئے کی رشوت دینے کی وجہ سے ہی ان کا تقرر بحیثیت ٹائپسٹ عمل میں آیا تھا اور یہی پچاس روپئے ان کی آنے والی زندگی کی عمارت میں سنگ بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ 1991ء میں جب وہ کوآپریٹیو انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کے باوقار عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو انہیں اپنے وظیفہ کے بھاری بقائے جات کو حاصل کرنے کیلئے پھر موٹی رقم بطور رشوت دینی پڑی۔ گویا جس رشوت کی مدد سے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا تھا اسی رشوت کے ذریعہ اپنی ملازمت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی۔ پہلی رشوت اور آخری رشوت کے درمیان بھی انہیں اپنے کئی کارناموں کے سلسلہ میں بار بار رشوت دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے ان رشوتوں کا بھی اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ہزاروں رشوتیں ایسی کہ ہر رشوت پہ دم نکلے

یوں لگتا ہے جیسے وہ سرکاری فرائض کم انجام دیتے رہے اور رشوت دینے کی ''جین ڈائری'' زیادہ مرتب کرتے رہے۔ بہرحال جب وہ باعزت طور پر ریٹائر ہوگئے تو ان کے ضمیر نے جاگنا شروع کر دیا۔ یوں بھی ہمارے یہاں ضمیر اسی وقت جاگتا ہے جب خود آدمی کو نیند آنے لگتی ہے۔ ان کے ضمیر نے اب انہیں جھنجھوڑنا شروع کیا تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کتاب کے ذریعہ ساری قوم کو جھنجھوڑا جائے۔ گویا ضمیر، قدیر زماں کو جھنجھوڑ رہا ہے اور جواباً قدیر زماں قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کریم نگر کے اس عہدیدار کو جس نے 1951ء میں قدیر زماں کو ملازمت دینے کے عوض ان سے پچاس روپئے کی رشوت لی تھی اگر پتہ چل جاتا کہ وہ بعد میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھیں گے تو بخدا وہ قدیر زماں کو اُلٹا رشوت دیتا کہ بھیا! میں تمہیں اچھی سے اچھی ملازمت دیتا ہوں مگر وعدہ کرو کہ کوئی کتاب نہیں لکھو گے۔ ہمیں اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک کنجوس مکھی چوس شخص مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا اور جنّت کے داروغہ سے ملتمس ہوا کہ اسے جنت میں جانے کی اجازت دی جائے۔ داروغہ جنّت نے پوچھا ''اگر تم نے نیچے کی دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہو تو بتاؤ تاکہ اس کی بنیاد پر تمہیں جنت میں بھیجا جاسکے''۔ کنجوس آدمی نے دماغ پر زور دیا مگر اسے کوئی نیک کام یاد نہیں آیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب اسے اپنا ایک نیک کام یاد آیا تو خوشی خوشی بولا ''ایک بار ایک بڑھیا بھوک سے تڑپ رہی تھی تو میں نے اُسے ایک چونّی دی تھی''۔ اس پر جنت کے داروغہ نے جنت کے چوکیدار سے کہا ''میاں اس کی چونّی واپس کرو اور اسے لے جا کر دوزخ میں ڈال دو''۔ مبادا یہ نہ سمجھئے کہ قدیر زماں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے۔ ان کا ایک نیک کام نہیں کیا ہے۔ وہ کوئی برا کام کر ہی نہیں سکتے (کتاب لکھنے کے سوا)، ان کا ایک نیک کام یہی کیا کم ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہمارے دوست بنے ہوئے ہیں۔ جبکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جسے ہم جیسا دوست مل جائے اسے کسی دشمن کی حاجت نہیں ہوتی۔ ہزار بات کی ایک بات یہ کہ قدیر زماں اصل میں ایک سادہ لوح اور معصوم آدمی ہیں۔ وہ تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ ایک بار ہم نے مذاق میں اپنی آواز بدل کر انہیں بی بی سی کے انگریزی لہجہ میں فون کیا اور کہا I am John Major from London. I want to talk to Kadir Zaman (ان دنوں جان میجر برطانیہ کے وزیراعظم تھے) قدیر زماں نے کسی قدر جھجک کر پوچھا ''معاف کیجئے، آپ کون بول رہیں؟''۔

ہم نے پھر جان میجر کا حوالہ دیا تو نہایت ادب کے ساتھ اپنی مخصوص انگریزی میں "Good Moring, Your Excellency" وغیرہ کہا۔ تب ہم نے اپنے اسی لہجہ اور اعتماد کے ساتھ کہا ''مسٹر قدیر زماں ہم ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے''۔ اس پر قدیر زماں نے بے ساختہ کہا "Your Excellency ! My humble services are Always at you disposal" ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا۔

شام میں وہ ہمیں ملے تو حسب معمول ان سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ تُنک کر بولے آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ جس آدمی کے پاس وزیراعظم برطانیہ جان میجر کے فون آتے ہوں وہاں آپ کی کیا حیثیت ہے۔ اور ہم اپنی حیثیت پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال یہ ان کی سادہ لوحی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس ملک میں بوفورس اسکینڈل چل رہا ہو، جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے لیڈروں کو رشوت دینے کا معاملہ درپیش ہو، جہاں چارہ گھوٹالے میں کروڑوں روپیوں کے وارے نیارے ہورہے ہوں، وہاں ان کے پچاس روپیوں اور ہزار ڈیڑھ ہزار روپیوں کی رشوتوں کو کون پوچھے گا۔ بھلا نقارخانہ میں کسی نے طوطی کی آواز سنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدیر زماں خود اپنی ذات سے ایک ایسا طوطی ہیں جس میں ہر دم ایک سالم نقارخانہ گونجتا رہتا ہے۔ ان کی ابتدائی رشوت کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ 1951ء میں ایک دن وہ اپنے چچا کی نئی نویلی سائیکل کو لے کر غفلت میں کاچی گوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تھے جہاں ریلوے پولیس کے ایک داروغہ نے ان کی سائیکل کو ضبط کرلیا اور اس کی رہائی کے لئے دو روپئے رشوت دینے کا طلب گار ہوا۔ ان کے پاس اس وقت دو روپئے بھی نہیں تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر کار انہوں نے ضمانت کے طور پر اپنی شیروانی داروغہ کے پاس رکھوائی اور گھر جاکر دو روپئے لے آئے۔ تب کہیں جاکر اپنے چچا کی سائیکل اور اپنی شیروانی واپس حاصل کی۔ رشوت کے اس واقعہ کو انہوں نے ایسے کرب اور اذیّت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لگتا ہے قلم اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا۔ تاہم اس ناخوشگوار واقعہ کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ قدیر زماں نے بعد میں شیروانی پہننا ہی ترک کردیا۔ بش شرٹ اور شرٹ جیسے اوچھے لباسوں پر اُتر آئے پھر بھی اسے ان کی ہمت ہی کہنا چاہئے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو سرے سے لباس پہننا ہی ترک کردیتے۔ اس کتاب میں اور بھی کئی دلچسپ واقعات ہیں جن میں رشوت دینے کے نت نئے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیر زماں نے ایک عہدیدار کو رشوت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اس عہدیدار کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف ہوجاتے تھے اور جان بوجھ کر اس وقت تک ہارتے رہتے تھے جب تک کہ رشوت کی مطلوبہ رقم قدیر زماں کی جیب میں سے نکل کر عہدیدار کی جیب میں منتقل نہیں ہوجاتی تھی۔ ایسی رشوتیں تو ہم نے بھی اپنی سرکاری ملازمت میں بہت سی دی ہیں۔ ہمارے ایک عہدیدار بالا شاعر تھے اور جب بھی وہ ہمیں شعر سناتے تھے تو ہم اس پر کچھ اس طرح داد دیتے تھے کہ لگتا تھا رشوت دے رہے ہیں۔ آخر میں ہمارے عہدیدار بالا کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس دنیا میں ان سے بڑا شاعر اور ہم سے بڑا سخن فہم پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگرچہ قدیر زماں کی یہ کتاب رشوت ستانی کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر شائع کی گئی ہے لیکن دیدۂ بینا رکھنے والے اصحاب اس کو بطور ''ہدایت نامہ رشوت ستانی'' کے طور پر بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔

آخر میں یہ عرض کرتے چلیں کہ اس کتاب کو لکھتے وقت قدیر زماں کی نیّت بالکل صاف رہی ہے۔ انہوں نے وہی لکھا ہے جو ان

کے ضمیر نے لکھوایا۔ مانا کہ انہوں نے جو رشوت دی ہے کہ اس کی رقم بوفورس اسکینڈل وغیرہ کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن قدیر زماں کوئی سیاست داں تو ہیں نہیں کہ بھاری رشوتیں لیتے اور دیتے رہیں۔ فوٹو گرافی میں ایک طریقہ تصویروں کو انلارج (Enlarge) کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنے ذہن میں انلارج کریں تو آپ پر حقیقت آشکار ہوگی۔

تو حضرات! ہمارے تھوڑے لکھے کو بہت جانئے اور آج ہی سے رشوت دینا اور لینا بند کر دیجئے۔ یہ بہت بُری لعنت ہے۔ اتنی بُری لعنت ہے کہ قدیر زماں جیسے ادیب کو کتاب لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کالم کے عوض ہم قدیر زماں سے کچھ نہیں چاہتے۔ بس اتنی ہی گزارش ہے کہ جب بھی ہم حیدرآباد آئیں تو اپنی موٹر میں ہماری سیر کرا دیں۔ یوں بھی ہم ان کی موٹر میں اکثر گھومتے رہتے ہیں نعوذ باللہ یہ نہ سمجھئے کہ قدیر زماں ہمیں اپنی موٹر میں گھما کر ہمیں رشوت دے رہے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو ہمارے دوست ٹھہرے۔

(23 نومبر، 1997ء)

پس نوشت

بالآخر 20 جنوری کو قدیر زماں طویل علالت کے بعد ہمیں یکا وتنہا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ اِن سے ہمارے 65 برس پرانے مراسم تھے۔ اس اعتبار سے وہ ہماری نوجوانی کے دنوں کے اکیلے دوست باقی رہ گئے تھے۔ ادب اور ثقافت سے اُن کا سروکار نہایت گہرا تھا۔ وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور تبصرہ نگار بھی تھے۔ ان کے بعض ڈرامے خاصے مقبول ہوئے۔ چار سال پہلے انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے شہرہ آفاق ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی تلخیص ''وزیر خانم'' کے عنوان سے کی تھی جسے ادبی حلقوں میں خاصا سراہا گیا تھا۔ وہ طویل عرصہ سے صاحب فراش تھے میں اور پروفیسر بیگ احساس وقفہ وقفہ سے ان کی عیادت کیلئے اُن کے گھر جایا کرتے تھے۔ دس بارہ دن پہلے ہم ان کے گھر گئے تو سو رہے تھے۔ ہمارے آنے کی آہٹ سن کر اچانک جاگ گئے۔ بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر ہم لوگوں نے انہیں منع کر دیا۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کی باتوں میں علالت اور کمزوری کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آئے۔ میں نے موقع کو غنیمت جان کر اپنے فون سے گلبرگہ میں وہاب عندلیب سے اور الہ آباد میں شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کی بات کروائی۔ بے حد خوش ہوئے، وہ ان دونوں اصحاب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ان سے یہ میری آخری ملاقات ہوگی۔ (مجتبیٰ حسین)

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

طنز و مزاح

مطالعہ اور بلڈ پریشر

جب سے ہم نے کالم نگاری شروع کی ہے، ڈاکٹر انور سدید نے کتابیں لکھنے کی رفتار تیز کر دی ہے۔ شاید وہ زود نویسی میں ہمارا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کیا اور ہماری بساط کیا کہ ہم ان کے مقابلے پر آئیں۔ ہم جتنی دیر میں ایک کالم لکھتے ہیں، وہ اتنے وقت میں تین چار سو صفحات کی کتاب لکھ ہی نہیں لیتے، زیور طبع سے آراستہ بھی کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ انھیں کسی قسم کے زیور کی، حتیٰ کہ زیور طبع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم زود نویسی کے میدان میں اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ ہم ہفتے میں ایک سے زیادہ کالم نہیں لکھ سکتے۔ ہم چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے اور ڈاکٹر انور سدید چاہتے ہیں کہ ہم ان کی ہر کتاب نہ صرف پڑھیں بلکہ اس پر کالم بھی لکھیں۔ کالم لکھنا نسبتاً آسان ہے کہ اس میں ہماری گرہ سے کچھ نہیں جاتا، جس پر ہم لکھتے ہیں اسی کے دل میں گرہ نہیں پڑی، وجہ ظاہر ہے، دبستان فنون کی عنایت سے ان کے دل میں اتنی گرہیں پڑ چکی ہیں کہ مزید کسی گرہ کی گنجائش نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف پڑھنے کا کام خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا خطرناک بھی ہے۔ اس کی وجہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اب پھر عرض کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ علم کے ساتھ بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ذریعے حاصل کردہ علم تو بے ضرر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے اور قارئین میں تقسیم کر دیتے ہیں لیکن بلڈ پریشر کے نقصانات سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف ''دلّی دور نہیں'' پڑھنے کے دوران ہم پر کیا گزری۔ بلڈ پریشر بڑھنے کی وجہ خود بخود سامنے آجائے گی۔

اردو والوں پر غالب کے بے شمار احسانات ہیں۔ کوئی غالبؔ کی وجہ سے ناقد بن گیا اور کوئی محقق۔ جن کی قسمت میں نقاد بننا لکھا تھا نہ محقق، وہ ماہرین غالبیات بن گئے۔ غالبؔ کے نام پر ادارے قایم ہوئے تو بہت سے بے روزگار کام سے لگ گئے۔ ملکوں ملکوں غالبؔ سے می نار ہونے لگے تو یاروں کی سیر و سیاحت کے مواقع ملنے لگے۔ ڈاکٹر انور سدید بھی فیضان غالب سے محروم نہیں رہے۔ انھوں نے غالبؔ پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ یہ اتنی اچھی کتابیں ہیں کہ غالبؔ کی روح خوش ہوگئی اور خوش ہو کر یہ انعام دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو غالبؔ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے دلّی طلب کر لیا۔ حالاں کہ کتابیں لکھ کر غالب پر وہ پہلے ہی فاتحہ پڑھ چکے تھے۔

۱۹۸۸ء میں دلی میں غالب سے می نار ہوا جس میں چند پاکستانی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ ادیبوں کے اس چھوٹے سے گروہ کے میر کارواں ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کارواں کے میر، آغا صاحب ہوں گے اس میں ڈاکٹر انور سدید کا شامل ہونا لازمی ہے کہ جرس کارواں کے بغیر کارواں مکمل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی

ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید اس حد تک لازم وملزوم ہو چکے ہیں کہ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب کی تاریخ میں دوستی کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ فریقین نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے یہ شراکت فی الحال نقصان تک محدود ہے، انشاءاللہ آیندہ نفع بھی ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید نے دلی میں چند روزہ قیام کی خوش گوار یادوں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے ایک اہم ادبی خدمات انجام دی ہے۔ یہ روداد پہلے ماہ نامہ ''تخلیق'' لاہور میں قسط وار شائع ہوئی تھی اور اب ''دلّی دور نہیں'' کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ بلا شبہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جسے مصنف کے باغ و بہار اسلوب نے ایک اہم ادبی تخلیق بنا دیا ہے۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب کو غالب سے می نار کا دعوت نامہ ملا تھا، اسی وقت انھوں نے سفر نامہ لکھنے کے لیے چند قلم اور کاغذ کا پورا ایک ریم خرید لیا تھا اور سفر شروع ہونے سے پہلے ہی سفر نامے کے چالیس پچاس صفحات لکھ لیے تھے۔ ان صفحات میں سفر کی نیت باندھنے اور سفر کے شروع ہونے کی درمیانی مدت کے کوائف ہیں۔ یہ کوائف اتنے دلچسپ ہیں کہ اگر خدانخواستہ سفر کا ارادہ فسخ ہو جاتا تو صرف تمہیدی صفحات کی اشاعت بھی فائدے سے خالی نہ ہوتی۔ ہاں یہ نقصان ہوتا کہ ایک ریم کاغذ کا بڑا حصہ خالی رہ جاتا۔

اصل سفر نامہ دلی ائیر پورٹ سے شروع ہوتا ہے جہاں کئی ہندوستانی ادیب ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مہمان اور میزبان ایک دوسرے سے گلے ملے اور ادبی گفتگو شروع ہوگئی۔ جتنے عرصے ڈاکٹر صاحب نے دلّی میں قیام کیا، یہ گفتگو جاری رہی۔ گویا یہ سفر نامہ ادبی مکالمات کا ایک خوب صورت مجموعہ ہے جس میں واقعات آٹے میں نمک کے برابر نظر آتے ہیں اور وہ بھی مزید ادبی گفتگوؤں کا وسیلہ بننے کے لیے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے بھانت بھانت کے ادیبوں سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور غالب سے می نار کے اجلاسوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی ڈاکٹر صاحب کے ہم رکاب ہیں اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اپنے کانوں سے سن رہے ہیں۔ اس سفر نامے کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں ہمارا ادب کس حال میں تھا، غالب ادبی رجحانات کیا تھے، ادیب ایک دوسرے کی عدم موجودگی میں کس قسم کی رایوں کا اظہار کرتے تھے اور کن مسائل پر سوچتے اور گفتگو کرتے تھے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گفتگو سے پہلے سوچتے تھے یا بعد میں۔

دلّی کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے سیاحوں نے اس شہر بے مثال کے سفر نامے لکھے ہیں اور بہت سے محققوں اور مورخوں نے دلّی کی تاریخ، ثقافت اور آثار قدیمہ کو موضوع بنا کر دادِ تحقیق دی ہے لیکن دلّی کے بارے میں جیسی کتاب ڈاکٹر انور سدید نے لکھی ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں دلّی دور نہ ہونے کے باوجود دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر انور سدید کو دلی سے ہم کلام ہونے کے لیے جو چند روز ملے تھے، وہ انھوں نے اپنی قیام گاہ رنجیت ہوٹل اور ایوان غالب کی نذر کر دیئے یا پھر کچھ وقت دو تین علمی و تعلیمی اداروں میں اور اشتہا انگیز دعوتیں کرنے والے دوستوں کے گھروں میں گزار دیا۔ ہمیں ان سے توقع تھی کہ وہ یہ بتائیں گے کہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کا کیا حال ہے، یہ تہذیبی مرکز پہلے کی طرح اب بھی آباد ہے یا اجڑ چکا ہے۔ پرانا قلعہ، قطب مینار اور مقبرہ ہمایوں اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں یا ان کی جگہ جدید طرز کی عمارتیں بن چکی ہیں۔ چاندنی چوک کی چہل پہل ویسی ہی ہے جیسی بارگاہ قلی خان نے اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی

میں دیکھی تھی اور جس کی تفصیل اس کی کتاب ''موقع دہلی'' میں ملتی ہے، یا اس رونق میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دلی میں رہ کر اردو کے بزرگ شاعر آنند نرائن ملّا سے بھی ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی، یہ وہی تاریخی بزرگ ہیں جنھوں نے اعلان کیا تھا کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اردو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ڈاکٹر انور سدید نے دلی میں جن ادیبوں سے ملاقات کی، ان سے اکثر وہ تھے جن سے وہ پاکستان میں مل چکے تھے یا پھر وہ ''ادیب'' تھے جن کے دلی میں موجود ہونے کا خود دلی والوں کو بھی علم نہیں تھا۔

دلّی میں رہ کر دلّی سے اسے بے نیازی کی ڈاکٹر انور سدید سے توقع نہیں تھی۔ ایسی بے نیازی استاد لاغر مرادآبادی ہی کو زیب دیتی ہے جنھوں نے قیام پاکستان سے پہلے برسوں آگرے کے مشاعروں میں شرکت کی مگر کبھی انھیں تاج محل دیکھنے کا خیال نہیں آیا اور اب بھی انہیں اس کا ملال نہیں ہے۔ ملال ہے تو اس کا کہ اب آگرے والے مشاعروں میں نہیں بلاتے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہم گزارش کریں گے کہ ان کے سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو تو اس کے نام میں تھوڑی سی ترمیم کر دیں۔ ''ابھی دلّی دور ہے'' مناسب ترین نام ہوگا۔

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں اور سچی باتیں مذاق ہی میں اچھی لگتی ہیں لیکن اصل بات جو ہمیں کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کا سفرنامہ اس خرافات نگاری سے پاک ہے جو خواتین کے حوالے سے ہمارے سفرنگاروں کا معمول ہے۔ جہاں کہیں خواتین کا ذکر آیا ہے ڈاکٹر صاحب نے حدّ ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ ایک خاتون نے خود ہی ادب کی حد کو پھلانگنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر صاحب نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ ہوا یوں کہ بھری محفل میں ایک خاتون نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنی دائیں ہتھیلی پھیلا کر آٹو گراف مانگا۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا ان کے پاس ایسا قلم نہیں ہے جس سے ہتھیلی پر دستخط کیے جا سکیں۔ بات معقول تھی کہ سفر کے دوران نہ چھٹنے والی روشنائی کہاں سے آتی جو ڈاکٹر صاحب ہتھیلی پر سرسوں جماتے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب کو نہ چھٹنے والی روشنائی کے استعمال کا خاصا تجربہ ہے۔ اپنے مفروضہ دشمنوں کے بارے میں مضامین وہ اسی روشنائی سے لکھتے ہیں۔ زیرِنظر سفرنامے کے بعض حصے بھی انھوں نے اسی روشنائی سے لکھے ہیں۔

محترم احمد ندیم قاسمی کا ذکر اس سفرنامے میں ایک درجن سے زیادہ مرتبہ کیا گیا ہے اور ہر جگہ سخن گسترانہ انداز میں ہے۔ حیرت ہے کہ دلی میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے قاسمی صاحب کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں موقع ملا ہے کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دیا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۸ء کے لاہور کے فیض میلے میں بعض سخن ناشناسوں نے قاسمی صاحب کو کلام نہیں سنانے دیا تھا۔ اس واقعے کا دلّی یا دلّی کے سفرنامے سے کوئی تعلق نہیں لیکن داد دیجیے ڈاکٹر انور سدید کو کہ انھوں نے اس واقعے کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ انداز یہ اختیار کیا ہے جیسے سخن ناشناسوں کی حرکت انھیں ناگوار گزری ہو بین السطور سے دلی مسرت پھوٹی پڑتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے فیض میلے میں سخن ناشناسوں کو انھیں نے بھیجا ہو۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں ''خدا جانے اس محفل میں فیض میلے کا ذکر کس نے چھیڑ دیا اور پھر وہ واقعہ کیوں زیرِ بحث آ گیا جو کشور ناہید کی گرفت سے نکل کر عوام کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور ہمارے ایک محترم معمر شاعر کی بزرگی کی دستارِ فضیلت سنبھالی نہ جا سکی'' (ص ۹۰) ایک اور جگہ اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ''نہ جانے بات کا رخ کس طرح لاہور میں منعقد ہونے والے فیض میلے کے ایک ناخوش گوار واقعے کی طرف ہو گیا۔ اس واقعے پر ڈاکٹر قمر رئیس کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ سبط الحسن ضیغم تو

خاموش رہے لیکن میں نے قاسمی صاحب کی حمایت میں اس واقعے کی شدید مذمت کی (ص۱۹۱) اور باتیں تو ٹھیک ہیں مگر قاسمی صاحب کی حمایت کرنے کا ذکر پڑھ کر تو ہم ہنسے بغیر نہ رہ سکے حالاں کہ سنجیدہ باتوں پر ہنسنا شائستگی کے منافی ہے۔

اسی قسم کا سلوک ڈاکٹر سلیم اختر سے بھی کیا گیا ہے ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے، برنگِ دیگر آیا ہے۔ ایک جگہ تو ڈاکٹر انور سدید نے کمال ہی کر دیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر دعا مانگتے ہوئے بھی انھیں قاسمی صاحب اور ان کے حلقے کے لوگ یاد آئے۔ فرماتے ہیں ''مجھے وہ دوست یاد آرہے تھے جنھوں نے ادبی اختلاف کو ذاتی اختلاف بنا لیا تھا اور حسن دشنام کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ اپنی عمر بھر کی شہرت کو داغ دار کر لیا تھا۔ میں نے ان کے لیے محبوب الٰہی سے درخواست کی کہ ان کے دلوں کو کشادہ کر، ان کے قلوبِ مردہ کو زندہ کر، سیاہی کی لگی ہوئی مہروں کو توڑ دے، انھیں افسروں کی غلامی سے نجات دلا اور انھیں لفظ کے داخلی اسرار سے آشنا کر۔ یہ تخلیق کے خدائی کام کے برعکس دو پیسے کا دنیاوی کام کر رہے ہیں، ان کی کاری گری کا بہتر حق الخدمت دلا، انھیں بینک بیلنس اور بنگلے کی آشائش دے.... اس وقت میرے سامنے قاسمی صاحب کا چہرہ تھا۔ سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام سب لوگ موجود تھے''۔ (ص۲۲۷)

کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی تحریریں پڑھ کر ہمارے بلڈ پریشر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے!

(۲۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء)

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

شاعری

غزلیں

مصطفیٰ شہاب

انا پروری کا زمانہ نہیں ہے
کوئی سر کسی در سے اونچا نہیں ہے

جو تنہائیاں ہیں وہ خود ساختہ ہیں
حقیقت میں کوئی اکیلا نہیں ہے

کھلے اس کی چھب کے کئی رنگ مجھ پر
کہ اب روبرو اس کا چہرا نہیں ہے

نہیں آسماں شب سے اجلا ابھی تک
کوئی مشعلیں لے کے نکلا نہیں ہے

خزاں آئے چاہے چلے کوئی آندھی
مرا شاخِ گل پر بسیرا نہیں ہے

ترے بعد اب بھی محبت کا بادل
ٹھہرتا ہے سر پر، برستا نہیں ہے

شہابؔ اپنی قیمت لگا کر تو دیکھو
کبھی تم نے خود کو خریدا نہیں ہے

نظمیں

خلیل ماموں

کوئی آنے والا ہے

میں سوچتا ہوں
اور
خاموش ہو جاتا ہوں
یوں
جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو
کیوں کی پتیاں ابھرتی ہیں
کلیوں سے
رنگ آتا ہے پھر اڑ جاتا ہے
وقت گزر جاتا ہے
باقی کیا بچتا ہے
سمجھ میں نہیں آتا
حافظہ میں رہ جانے والی باتوں کو
ہم یاد کہتے ہیں
بار بار آنکھوں میں
ابھرنے والا نقوش کو
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں
اسی تسلسل کا نام
شاید زندگی ہے
نام دینے کی حقیقت ہی
شاید بہت بڑا عمل ہے
باقی صرف
طول امل ہے
میں تہذیب کے دروازے پر آ کر
واپس اپنے بے نامی کے قبرستان میں
چلا جاتا ہوں
ایک سی ہڈیاں
ایک سی قبریں
ایک سی مٹی دیکھ کے گھبراتا ہوں
اپنی وحشت پر
دل ہی دل میں چلاتا ہوں
اپنی ہی آواز کو سن کر
چپ ہو جاتا ہوں
کانوں میں
صرف اپنی ہی بازگشت سنائی دیتی ہے
آنکھوں کو سوکھی جھاڑیوں میں
اک پرچھائیاں بھاگتی نظر آتی ہے
شاید وہ تم ہو
جو مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہو

(۲)

یہ سب دیکھ کے
دل بہت للچاتا ہے
ہونٹوں پر خاموشی ہوتی ہے مگر
بے ساختہ آنکھوں میں آنسو آجاتا ہے
آسمان میں کہیں دور
کوئی تارہ لہراتا ہے
شاخوں میں زور زور کی ہوا چلنے لگتی ہے
شاید طوفان آنے والا ہے
شاید یہ شہر دل
بہہ جانے والا ہے
شاید کوئی بند دروازہ
کھل جانے والا ہے
شاید گھر پانی سے
بھر جانے والا ہے
شاید خطرہ کا شان
اوپر آنے والا ہے
شاید بہت دور سے
مجھے لینے کوئی آنے والا ہے

ایک نغمہ

لمبی رات کے سائے میں
یونہی گائے جاؤ
کوئی سریلا گیت
کوئی البیلا نغمہ
ایسی نشیلی دھن
جو خالی کانوں میں
شہد سا رس گھول دے
دودھ کی ندیاں بہادے
پازیب کی جھنکار سنادے
اندھیرا چھٹے نہ چھٹے
مسلسل گائے جاو
اُجالے کی آمد میں
انتظار کی گھڑیاں
یونہی بتائے جاو
ٹوٹے خوابوں کی بکھری کرچیاں
چن چن کر
انہیں دوبارہ ملائے جاو
آئینہ بنائے جاو
اپنے اندر کی شانتی میں
بلا تردد

(۳)

قلم

آئے جاو
محبت کی سنسان گلیوں میں
سدائیں لگائے جاو
خوف و ہراس کے بند دروازوں پر
دستک دیئے جاو
رات اندھیری بھی ہے، لمبی بھی، اکیلی بھی
محبت کا کوئی گیت
الفت کا کوئی نغمہ
گائے جاو
کٹے نہ کٹے رات
چاہے ختم ہو جائے کائنات
ٹوٹے نہ دل کی بات
چھوٹے نہ اپنا ساتھ
دل کی دھڑکن ہی سے
اپنے سر ملائے جاو
گائے جاو
رات اندھیری ہے
گائے جاو

ریاکار قلم
جھوٹ بولتا ہے
طوائف الملکی میں
غزل لکھتا ہے
ناگ پھنی کو
کنول کہتا ہے
جیسے
کسی پتھریلے صحرا میں چمکتا سراب
کسی بوڑھی بیوا کا شباب
یا پھر
کسی مدہوش ذہن کا خواب
عرش اور فرش پر
کوئی خدا نہ ہو تو
کیا کوئی زمزمہ نہیں ہوگا
جب آسمانی خلا میں
پرندے اڑتے پھرتے ہیں
تو کیا
خاموشی بھی نغمہ سرا نہیں ہوگی
کوئی ہو نہ ہو
بپتا تو ضرور ہوگی

(۴)

وہی
ہماری دکھتی آنکھوں کا نور ہوگی
پھر بھی
کسی بوڑھے پیڑ کی برہنہ
شاخوں کی طرح
قلم خاموش کھڑا تماشا دیکھتا ہے
کوئی سچ نہیں بولتا
کسی جھوٹ کا بھانڈا نہیں پھوڑتا
صرف جیب کی زینت بنا رہتا ہے
جب لکھتا ہے
تو کاغذ پر حروف نہیں اُبھرتے
اپنی روشنائی کے ساتھ بھی
بے وفائی کرتا ہے
ریاکار قلم جھوٹ بولتا ہے
گزرے ہوئے شہنشاہوں کے
قصیدہ خوانوں کی طرح
منہدم محلات کی ٹوٹی دیواروں کی طرح
اُلّو ؤں اور چمگاڈروں کا مسکن بنتے ہوئے
معصوم عوام کی شہ رگوں سے
خون چوستا ہے
اندھی آنکھوں کو
ہتھیلی میں بہشت دکھاتا ہے
آسمان وزمین کے قلابے ملاتا ہے

ریاکار قلم جھوٹ بولتا ہے
یہ نہ اپنا ہے نہ پرایا ہے
اس کے محدود جسم سے
سچ کا لہو کشید کر لیا گیا ہے
اور اس میں کذب وافترا
گدلا پانی بھر دیا گیا ہے
اب یہ لکھے تو کیا لکھے
جو لفظ ابھرتے ہیں
ان میں حرف
ظلمت کا حسن
نیند کی غنودگی
اور موت کا سکوت ہے
یہی تو لکھنے والے کی اُجرت ہے
بھلا وہ فی سبیل اللہ کیوں لکھے
اس کا پیٹ کیسے بھرے
وہ کیسے جیئے
سچ کا کوئی مول نہیں
جھوٹ کی اجرت بھی ہے
عزت بھی ہے
شہرت بھی ہے
اسی لیے تو
ریاکار قلم صرف جھوٹ بولتا ہے
جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں بولتا

(۵)

مجھے ڈر لگتا ہے

کچھ لمحوں سے
کچھ عرصہ سے
کچھ مہینوں سے
کچھ سالوں سے
مجھے ڈر لگ رہا ہے
بہت ڈر لگ رہا ہے
بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے
میں جب آئینہ کے روبرو کھڑا ہوتا ہوں
تو مجھے اپنے عکس سے ڈر لگتا ہے
کیا پتہ یہ میں ہوں
یا میری شکل میں کوئی بہروپیہ
جو مجھے دھوکے سے مار دینا چاہتا ہے
میں نے
آئینہ دیکھنا بند کر دیا ہے
پھر بھی مجھے وحشت ہوتی ہے
کبھی اپنے گھر سے
کبھی اپنی بیوی سے
کبھی اپنے بچوں سے
کیا پتہ یہ بھی میرے دشمن کے خبر رساں ہوں
جو میری ہر حرکت پر نظر رکھتے ہوں
میرے کھانے پینے میں کچھ ملانے کے
کوشاں ہوں
میں نے گھر کا کھانا پینا بند کر دیا ہے
اب بازاری بسکٹوں پر
میرا گزر ہے
کبھی کبھی تو
گھر میں آنے والے
کاروباری لوگوں سے بھی ڈر جاتا ہوں
جب بھی دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے
میں دروازہ کھولتے ہوئے ڈرتا ہوں
اگر کوئی ڈاکیہ بھی ہو تو میں
اس سے کوئی لفافہ یا پارسل نہیں لیتا
اسے میز پر رکھنے کے لیے کہتا ہوں
کیا پتہ اس میں کوئی بم پوشیدہ ہو
چلتے ہوئے میرے پیر کانپتے ہیں
بات کرتے ہوئے میرا جسم تھرتھراتا ہے
میں گھر سے باہر نہیں جاتا
کسے خبر
میں گھر سے نکلوں اور کوئی مجھ پر پتھراؤ کر دے
یا لاٹھیوں سے وار کر دے
اور میں وہیں سڑک پر ڈھیر ہو جاؤں
میری لاش سڑک پر پڑی رہے
میں بسوں اور کار میں بھی سفر نہیں کرتا

(۶)

کسے پتہ
کب کون اچانک آ جائے
اور پٹرول چھڑک کر گاڑی کو آگ لگا دے
اور میری لاش
شناخت کے بھی قابل نہ رہے
اور کسی سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں
کئی دن بے کار کسی لاوارث کی طرح پڑی رہے
میں موبائیل پر بھی کسی کی کال نہیں لیتا
کون جانے کب کوئی مجھے خون کرے
اور مجھے میری موت کی جگہ اور وقت
بتلا دے
مجھے ڈر لگتا ہے
سب سے
پولیس سے
ججوں سے
سیاستدانوں سے
رپورٹروں سے
کہ یہ میرے وجود کو اور زیادہ
ننگا کر کے قاتلوں کو مجھے مارنے کا
کھلا موقعہ دیں گے
مجھے ڈر لگتا ہے اپنے ہم مسلکوں سے بھی
کہ انہی میں سے کوئی
میرے ہونے کی دشمنوں کو خبر دے گا
مجھے خدا کے نظام سے زیادہ
انسانوں کی بدنظمی پر یقین ہے
اپنی زندگی سے زیادہ موت پر ایمان ہے
بقا سے زیادہ فنا پر ایقان ہے
مجھے ہستی پر گمان ہے
مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے
میں ہندوستانی ہوں!

OO

ہیرامن

سب ہیرامن کی کارستانی ہے
جائسی کا ہیرامن
جس نے پورے بھارت میں
آگ لگائی ہے
یہ سنجے لیلا بنسالی!
بیچ میں کہاں سے آ گیا
مفلوک الحال اذہان کی بھوک کا قہر
سب پر ٹوٹ رہا ہے
صدیوں پہلے کے اک شاعر کا کرتب
ادبی گلدستہ سے ببول کیسے بن گیا
جائسی کو کیا سوجھی کہ اس نے پدماوت لکھی
سنجے کو کھجلی کیوں ہوئی کہ اس نے فلم بنائی

(۷)

بے کار فلمیں جس پر بے کار کی ہاہا کار مچی ہے
بے چارہ علاء الدین خلجی
دوسروں کی باتوں سے
ملک کے چپہ چپہ پر
مرنے کے بعد
دوبارہ مارا جا رہا ہے
رتن سنگھ نے آخر ناگ منی سے بے وفائی کیوں کی!
اور پھر جنگ میں مر کر خلاصی پالی
پدمنی کے ہیولے نے جوہر میں
بہ ظاہر قصہ تمام کر دیا
لیکن قصہ تو آج بھی زندہ ہے
اور شاید آئندہ بھی زندہ رہے گا
پائندہ رہے گا
باقی رہ گئے ہیں
اناڑی ناظرین
جلتے سنیما گھروں کے پردے
سرکاری فسادی
ریاکار سیاستدان
تماشا بین پاسبان
انسانوں سے ڈر کر
بنگلوں کی طرف بھاگتے بے چارے حیوان
سڑکیں ویران

عوام اپنے ناکردہ گناہوں پر پشیماں
ہیرامن نے یہ کیا کر ڈالا!
صدیوں بعد
سارے ملک میں
فساد برپا کر ڈالا
کہانی تو یہ ایسی ہے
جیسے
کھودا پہاڑ نکلا چوہا
لیکن
یہاں تو چوہا بھی نہیں ملا
خلجی نے بھی
راگھو چیتن کے کہنے پر
بے کار ہی
چتوڑ پر حملہ کیا
سوا بدنامی کے
اس نے کیا پایا
ایسی ازلی بدنامی
جو تا قیامت چلتی رہے گی
قصہ کہانی سے ہٹ کر
حقیقت میں لوگوں کے ہاتھوں پٹتی رہے گی
معصوم عوام کی گردنوں پر
زہریلی ناگن بن کر پلتی رہے گی

(۸)

راجہ مہاراجاؤں کی
گندی تاریخ اپنا کام کرتی رہے گی
آخر
ہیرامن نے رتن سنگھ کو
پدمنی کی کہانی کیوں سنائی
داستان اس دوشیزہ کے
حسن کی اسے کیوں بتائی!
یہ بھی اگر
ناگزیر تھا
توراگھوچیتن نے
خلجی کو جنگ پہ کیوں اکسایا
کیوں چتوڑ بلایا
کیوں قسمت نے
دوسرے راجہ کو بھی
پدمنی پر فریفتہ ہونے کا
گر سکھلایا
جائسی کے شاہ کار نے
بنسالی کی بے کار فلم نے
ہیرامن کی خیالی داستان نے
راگھوچیتن کی چغلی نے
پہلے سے خون آلودہ تاریخ کے پنوں پر
اور زیادہ گندگی کیوں پھیلائی

کس نے رائی کا
پہاڑ بنایا
مدہوش ذہن کی
کس نے نیند اڑائی
ان سب باتوں میں
کن لوگوں کی ہے
خفیہ کمائی
ہیرامن کو کس نے اکسایا
یہ تو اک جھوٹے شاعر کی
خیال انگیزی ہے
اس پر رونا نہیں، ہنسنا چاہیے
قہقہہ لگانا چاہیے
آخر جھوٹ نے وہ کام کیا
جو کبھی سچ نہیں کر سکتا
پیاسی آنکھوں کو تراوٹ
ذہن و دل کو تازگی ملی
دھوپ خوابوں کی شام میں ڈھلی
پرندے سرمئی کالے آسمان میں اڑنے لگے
قیامت کا اک شور اُٹھا
اور پھر
سب آوازیں بند ہو گئیں

شاعری

نظم وغزل

اظہار وارثی

دھرماندھتا

دور تک پھیلی ہوئی
دھرماندھتا کی ایک دلدل
جس کی سیماؤں کے اندر
آپسی سوہارد
مریادا وچن کی
نیائے کی سروو چتا
مزدور کی روٹی، کسانوں کا بھوش
کل کارخانے، کھیتیاں
جن پد، نگر، آبادیاں
انسان کی انسانیت
سدبھاؤ، چاہت
بھائی چارہ، ایکتا، سہیوگ
سب کچھ دھنس رہا ہے
اور اس پیڑا بھرے واتاورن میں
آدمی کو آدمی کی جان کا دشمن بنا کر
آج بھی کچھ سوارتھی، بے درد، بے حس لوگ
مسجد اور مندر کے گگن چمبی کلش کی نوک پر
اپنا سنگھاسن سنتلت کرنے کی دھن میں مست ہیں

ہر ایک تیر نشانے کی آرزو میں ہے
زمیں لہو میں نہانے کی آرزو میں ہے
خلوص نام کی، اک ذاتِ بے امان و مکاں
بھٹک رہی ہے ٹھکانے کی آرزو میں ہے
درندے لاشوں کو چیٹ کر رہے ہیں کب سے، اور
کبوتر آج بھی دانے کی آرزو میں ہے
عذاب ٹوٹ رہا ہے، سیاہ لمحوں کا
اندھیرا پاؤں جمانے کی آرزو میں ہے
بنائے رکھنا سحر تک ہتھیلیوں کا حصار
ہوا چراغ بجھانے کی آرزو میں ہے
امیر، قصر امارت میں روشنی کے لیے
گھروں کو آگ لگانے کی آرزو میں ہے
غم جہاں سے سبکدوش ہو سکوں تو کہوں
کسی کا سر مرے شانے کی آرزو میں ہے

شاعری

غزلیں

احمد نثار

اگر دہشت زدہ کوئی نہیں ہے
شکستہ آئینہ کوئی نہیں ہے

سبھی ہیں منکشف اک دوسرے پر
کسی سے بولتا کوئی نہیں ہے

حسینی مرتبہ کے سب ہیں خواہاں
شریکِ کربلا کوئی نہیں ہے

کھلا ہے ذہن ہی آٹھوں پہر اب
دریچہ دوسرا کوئی نہیں ہے

رکا اس موڑ پر میں ہوں نثؔار اب
جہاں سے راستہ کوئی نہیں ہے

زندگی میں نئی سحر آئے
یہ دعا ہم بھی آج کر آئے

خوف کے سائے ہر سو پھیلے ہیں
ہم فلک سے کہاں اُتر آئے

آج بھی میرے دل میں حسرت ہے
تو مخالف مرا نظر آئے

ٹاٹ کے جنکے گھر میں پردے ہیں
آج سلطان ان کے در آئے

پھر سلوک اس کا ہے یزیدانہ
چہرۂ آب ہی نظر آئے

اس نے غیرت سے توڑدی تلوار
ہم ہتھیلی پہ لیکے سر آئے

لوگ بھکتیں گے اس کا خمیازہ
سارے موسم ہی بے ثمر آئے

مجھ سے لپٹی ہوئی تھی تنہائی
خواب میں تم دمِ سحر آئے

جان تجھ پر نثؔار کرتا ہوں
کوئی آفت ہو میرے سر آئے

غزلیں

محمد عابد علی عابد

آنکھوں کا آئنہ ہے وہ نایاب آئنہ
ہوتی نہیں ضرورت اسباب آئنہ

چشم زدن میں خاک ہوئی جلوہ گاہ طور
دل ہے صحیح معنوں میں اسباب آئنہ

والد کی ہر خصوصیت آئی پسر میں تھی
رستم کا ہر طرح سے تھا سہراب آئنہ

سج دھج کے جانا چاہیے آئینے کے قریب
خو باں سے سیکھ لیجیے آداب آئنہ

آتی نہیں نظر انھیں خود اپنی خامیاں
عابدؔ ہمیں دکھاتے ہیں احباب آئنہ

حیدر وارثی

نبیؐ کی جب نبوت بولتی ہے
شریعت تب حقیقت بولتی ہے

منزّہ ہوں اگر اطوارِ ہستی
تو پھر نسلِ نجابت بولتی ہے

اگر موجود ہے دل میں محبت
تو یزداں کی عنایت بولتی ہے

اگر معدوم ہے بوئے اخوت
وہی صورت حقارت بولتی ہے

نہیں موجود ہے جس میں دکھاوا
وہ عبدیت صداقت بولتی ہے

اگر بھوکا رہے کوئی کھلا کر
تو پھر شانِ سخاوت بولتی ہے

نہ ہو بیگانہ پن حیدرؔ کبھی بھی
وگرنہ پھر عداوت بولتی ہے

اسلم جمشیدپوری

مضمون

۲۰۱۷ء کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک جائزہ

ہر سال جنوری کے مہینے کے آنے پر ہم نئے سال کا جشن مناتے ہیں۔ گذشتہ سال کا محاسبہ کرتے ہیں۔ نئے نئے منصوبے بناتے ہیں اور نشانے طے کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض منصوبے ہی بناتے رہتے ہیں اور سال خموشی سے گذر جاتا ہے۔ بعض اپنے اہداف سے بھی زیادہ عمل کر لیتے ہیں۔ بہر حال، زمانہ اور وقت یوں ہی لمحہ لمحہ، صبح سے شام، رات اور پھر نئے دن کی شروعات، سے گذرتے ہوئے دن، ہفتے، مہینے اور پھر ۱۲ مہینوں کے بعد سال، تبدیل ہو کر وقت نامی سمندر میں محض ایک بوند کی طرح سما جاتا ہے۔ سال کی ابتدا میں بارہ مہینوں اور 365 روزہ سال خاصا طویل نظر آتا ہے لیکن یہ کس برق رفتاری سے گذر جاتا ہے، اس کا احساس دسمبر کے آخری ہفتے میں شدید ہوتا ہے۔ اسی ہفتے، پورے سال کا محاسبہ کر کے نفع و نقصان کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ادب میں بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ ہر سال نئے ادب کی آمد ہوتی ہے اور متعدد تحریریں پس پردہ چلی جاتی ہیں۔ کئی نئے ادیب جلوہ گر ہوتے ہیں اور متعدد، ہم سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک 2017ء کے فکشن کا تعلق ہے تو کئی ناول، افسانوی مجموعے، فکشن تنقید کی کتب نے اپنی جانب توجہ مبذول کی ہے۔

2017ء کے ناول :

اس برس ہندو پاک میں متعدد ناول شائع ہوئے۔ اماوس میں خواب (حسین الحق)، خواب سراب (انیس اشفاق)، ہم جان (فارس مغل)، بے رنگ پیا (امجد جاوید)، خزاں کے بعد (نوشابہ خاتون)، دکھ دان (اسلام اعظمی) جج صاحب (اشرف شاد) میرے ہونے میں کیا برائی ہے (رینو بہل) اینکر (وقاص عزیز) خلش (سفینہ بیگم)، یہ راستہ کوئی اور ہے (اقبال حسن خاں)، کوہِ گراں (خالد محمد فتح)، سائے (محمد عامر رانا)، ڈیوس علی اور دیا (نعیم بیگ)، غلام باغ (مرزا اطہر بیگ) ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوا۔

جہاں تک اردو ناول کی سمت و رفتار کا تعلق ہے تو یہ بات لائق اطمینان ہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے ناولوں کی اشاعت مسلسل ہو رہی ہے۔ 2017ء میں بھی یہ رفتار اور تسلسل قائم رہا ہے۔ اس سال جن ناولوں نے خاصی شہرت حاصل کی ان میں حسین الحق کا ناول ''اماوس میں خواب'' ہے۔ حسین الحق کا یہ نیا ناول ایک طویل خاموشی کے بعد آیا ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول ''بولو مت چپ رہو'' اور ''فرات'' شائع ہو چکے ہیں۔ 1970ء کے بعد کی نسل میں آپ کا شمار سنجیدہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اماوس میں خواب ان کا اس سال شائع ہونے والا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ 2017ء میں شائع ہونے والا یہ ایک دھماکہ خیز ناول ہے۔ ناول تقسیم کی کوکھ سے جنم لینے والے ایسے انسان کی کہانی ہے جو تہذیب کی شکست و ریخت سے نہیں بلکہ تہذیب کے ہر پل بدلتے منظر نامے سے پریشان ہے۔ جو اپنے آپ کو ۴۷ سے موجودہ عہد 2016ء تک کے زمانے میں کہیں فٹ نہیں کر پاتا ہے۔ یہ ایسا انسان ہے جو مسلمان ہی نہیں، اسماعیل ہی نہیں، رمیش بھی ہے،، نہال سنگھ بھی، نائلہ بھی ہے، اسماعیل، جو ناول کا مرکزی کردار ہے، در اصل خواب اور تعبیر کے درمیان

ہچکولے کھانے والے شخص کا نمائندہ ہے۔جس کے اپنے خواب ہیں،تمنائیں اور آرزوئیں ہیں۔لیکن اس کے خواب،خواب ہی رہ جاتے،انہیں حقیقت کی زمین نہیں ملتی، کیونکہ حقیقت کی زمین تو ممبئی کے واقعات سے لے کر بہار اور پھر دہلی کے جے این یو تک تہذیب کے بدلتے منظر نامے میں گم ہوگئی ہے اور اس کے خواب چکناچور ہوئے ہیں، ورنہ اسمٰعیل کے خواب بھی، رنگین تھے،ان میں بھی زندگی کی تمام تر رعنائیاں موجود تھیں۔اسمٰعیل کے خواب میں شریک ہوکر قاری بھی تھوڑی دیر کے لیے خوابوں کی حسین وادی میں پہنچ جاتا ہے۔حسین الحق نے بہترین اسلوب کا استعمال کرتے ہوئے اسماعیل کا خواب بُنا ہے:

''اور پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا،حریری پردوں کی سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی، پردے ساکن نہیں تھے،مگر اٹھ بھی نہیں جارہے تھے۔اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے، کچھ جھلملا تا بھی رہے۔ ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکّیف ہوئیں کہ ماتھے پہ ان کے شکنیں مثل صف تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند سیاہ اور آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھیں،سفیدی تھی،شفق تھی،ابر باراں تھا،مگر یہ ابر کچھ رکا رکا سا تھا اور ناک کی کیل پھول پر شبنم اور لب...گلاب کی دو پنکھڑیاں ایک دوسرے سے وصل کے نشے میں سرشار، رخسار ڈوبتے ہوئے دوسرخ سورج جو روشنی کی ہلکی ہلکی پھوار پھینکتے ہیں،مگر اپنی گرمی سے پریشان نہیں کرتے،گردن انگوری شراب کا،ایسا جام جس کی ساری شراب کف ساقی کو بھگوتی محسوس ہو،سینہ خلد کے دو گنبدوں کا بیضوی عرصہ جس پر مینار کی انتہا کا نوکیلا پن بھی نمایاں ہو،کہنی سے ہتھیلی تک جلد ایسی شفاف کہ رگوں میں دوڑتا خون آئینے کی طرح عکس آسا اور شیشے کی طرح آر پار...''

[اماوس میں خواب،حسین الحق،ص31-30]

خواب کی عکاسی میں حسین الحق نے حسن کے بیان میں قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

اسی سال ایک اور بہت خوبصورت اور عمدہ ناول شائع ہوا''خواب سراب'' انیس اشفاق کا یہ خوبصورت ناول بھی حسین الحق کے خواب کی طرح کبھی خواب،کبھی حقیقت اور کبھی دونوں ،سراب کی صورت سامنے آتے ہیں۔انیس اشفاق،اس سے قبل'' دکھیارے'' لکھ کر ناول کی دنیا میں تہلکہ مچا چکے ہیں، جسے معروف فکشن نگار انتظار حسین نے کافی سراہا تھا۔انیس اشفاق افسانے بھی عمدہ لکھتے ہیں۔ تنقید میں بھی انیس اشفاق کا نام خاصا معروف ہے۔

انیس اشفاق کا ناول'' خواب سراب''ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔اس ناول میں انیس اشفاق نے لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کو Presurve کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔انہوں نے مرزا ہادی رسوا کے ناول''امراؤ جان ادا'' کے قصے سے قصے کو جوڑ کر لکھنؤ کی تہذیب کے باقیات اور موجودہ عہد میں سانس لیتی زندگی کو فنی چابک دستی سے ناول میں پرویا ہے:

'' میں اندر داخل ہوا تو دیکھا ایک بڑے کمرے میں جو کبھی بیٹھکے کے طور پر استعمال ہو تا رہا ہوگا، چاروں طرف تخت بچھے جن پر طرح طرح کے پرانے سامان قرینے سے رکھے ہیں۔ ان سامانوں میں نقشی پاندان، حقے، جریبیں، خاص دان اور سرمہ دانیاں، قد آدم آئینے، اگالدان، چپکنیں، اچکنیں اور زرکار دوشالے، سلفشیاں، آفتابے، سماور اور میر فرش، بہت عمدہ نقاشی والے چینی کے برتن اور نایاب نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔ تختوں کے پیچھے لکڑی کی دو بڑی میزیں تھیں جن میں سے ایک پر موٹی موٹی جلدوں والی بہت سی جہازی سائز کی کتابیں اور دوسری پر چھوٹے بڑے سائز کی جلد اور بغیر جلد والی کتابیں رکھی تھیں۔ انہیں میزوں سے کچھ دور پر کرم خوردہ کتابوں کے کئی بنڈل رکھے ہوئے تھے۔''

[خواب سراب، انیس اشفاق، ص19]

انیس اشفاق کا یہ ناول، ہماری روایت کو استحکام بخشتا ہے۔

اس سال ڈاکٹر رینو بہل کا ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' بھی منظر عام پر آیا ہے۔ ناول کا موضوع بہت نیا نہیں تو عام بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل نے بڑی فن کاری سے مرد، عورت کے علاوہ تیسری جنس کو موضوع بنا کر ایک خوبصورت ناول تحریر کیا۔ شیکھر نامی بچے کو جب آٹھ نو سال کی عمر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی زندگی کتنی بھیانک اور خطرناک ہو جاتی ہے۔ گھر، محلے کے افراد اور دوست احباب حتی کہ خونی رشتوں میں جو رویے کی تبدیلی آتی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ انہیں سب سے راہ فرار حاصل کر کے شیکھر، شکھا بن جاتی ہے۔ ناول سماج کی ایک دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سماج کی گندی ذہنیت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ پاکستان کے ناقد ڈاکٹر ریاض احمد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر رینو بہل نے جس پیرائے میں یہ ناول لکھا ہے، اسے پڑھنا، شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنا آسان نہیں۔ آخر میں وہ قارئین کی سوچ، رہنمائی اور عمل کے لیے اسی مجبور اور بے قصور فرد کی زبان میں ایک سوال چھوڑ جاتی ہے کہ میرے ہونے میں کیا برائی ہے۔''

[میرے ہونے میں کیا برائی ہے، ڈاکٹر رینو بہل]

ناولوں کی دنیا میں کئی برس سے تہلکہ مچانے والے پاکستانی ناول ''غلام باغ'' کو اس سال ہندوستان میں نئی آب و تاب کے ساتھ عرشیہ پبلی کیشنز نے از سر نو شائع کیا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کے ناول ''غلام باغ'' نے ہندوستان میں بھی خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ دراصل یہ ایک نئے طرز کا ناول ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کچھ اس طور ضم ہوتے ہیں کہ انسانی زندگی کے راز منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ تقریباً 900 صفحات پر پھیلے اس ناول میں زندگی کے نشیب و فراز حقیقت کے آئینے میں اپنی اصل شکل میں نظر آتے ہیں۔ ناول کے تعلق سے معروف فکشن نویس عبد اللہ حسین نے لکھا ہے:

''غلام باغ اپنے مقام میں اردو ناول کی روایت سے قطعی ہٹ کے واقع ہے بلکہ انگریزی ناول

میں بھی یہ تکنک نا پید ہے۔ اس کے ڈانڈے یوروپی ناول، خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں۔ ناول ایک انگریزی کا لفظ ہے جس کا مطلب ''نیا'' نہیں بلکہ اس کے اصل معنی ''انوکھا'' ہیں۔ اس لحاظ سے ''غلام باغ'' صحیح معنوں میں ایک ناول ہے۔''

[غلام باغ، مرزا اطہر بیگ]

''ڈیوس علی اور دیا'' عکس پبلی کیشنز، لاہور کے ذریعے شائع ہونے والا نعیم بیگ کا ایک اہم ناول ہے۔ نعیم بیگ موجودہ وقت میں پاکستان کے اہم فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مذکورہ ناول میں موجودہ سیاسی اور سماجی صورت حال کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ ناول میں جہاں سیاسی معرکے، دھوکہ بازیاں اور طوطا چشمی موجود ہے تو حسن و عشق یعنی رومان بھی موجود ہے۔ زمینی حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹے ''ڈیٹوس علی اور دیا'' ایک ایسا ناول ہے جس میں دلچسپی، حیرت اور واقعات و شخصیات کا ایسا تصادم ہے کہ پڑھنے والا ایک بار ناول شروع کرے تو پھر ختم کر کے ہی دم لے۔ ناول میں سارہ، نعمان، علی، دیا وغیرہ اہم کردار ہیں جو ہمارے آج کو پیش کرتے ہیں۔

خالد محمد فتح کا نیا ناول ''کوہِ گراں''، ناول کے قارئین کے لیے نیا پہلو لے کر آیا ہے۔ خالد محمد فتح یوں بھی منفرد فکشن نگار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں نے بھی چونکایا تھا۔ 'کوہِ گراں' میں خالد فتح محمد نے پانی کی قلت اور بحران کو کچھ اس طور موضوع بنایا ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقت بن گیا ہے، فاطمہ، گڈو، ویسو وغیرہ اس کے اہم کردار ہیں۔ ناول کی زبان متاثر کرتی ہے۔

سفینہ بیگم کا پہلا ناول ''خلش'' نے خاتون ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔ ''خلش'' میں چار لڑکیوں کے کردار ہیں جو اپنی اپنی قسمت سے مختلف النوع زندگی گذارتی ہیں۔ مرد اساس سماج میں خواتین کے کردار کا کیا مقام و مرتبہ ہے، 'خلش' میں بہتر طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمے اور تصادم وغیرہ ناول نگار کی فن پر دسترس کے غماز ہیں۔ پروفیسر عقیل احمد صدیقی ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان لڑکیوں میں بعض کی تقدیر مرد اساس معاشرے کے تشدد سے لکھی جاتی ہے، جس میں ایک نمایاں پہلو استحصال بھی ہے اور جس کے خلاف مصنفہ نے اخلاقی جرأت کا اظہار کرتے ہوئے ان لفظوں میں احتجاج کیا ہے کہ عورت جیت کر بھی نہیں جیت پاتی اور مرد ہار کر بھی جیت جاتا ہے۔''

[خلش، سفینہ بیگم، فلیپ کور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس]

محمد عامر رانا کا ناول ''سائے'' نے بھی اپنی موجودگی درج کرائی ہے، لاہور کی زندگی، عام زندگی کے کرب اور رشتوں کے نشیب و فراز کو عمدگی سے ناول میں سمویا گیا ہے۔

نوجوان فکشن نگار سلمان عبدالصمد کے ناول ''لفظ لفظ لہو'' کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آیا ہے۔

2017ء کا افسانہ

جہاں تک 2017ء کے افسانوں کا معاملہ ہے تو اس سال افسانوی مجموعے کچھ کم شائع ہوئے۔ پھر بھی ''پورٹریٹ'' (اقبال حسن آزاد) اضطراب (افشاں ملک)، اب میں وہاں نہیں رہتا (دیپک بدکی)، جہاں گم گشتہ (نگہت سلیمی)، بات کہی نہیں گئی (سیمیں کرن)، کھویا ہوا جزیرہ (عبد

القیوم خالد)، دعا کی قبولیت (حسن نظامی کیراپی) آئینہ گر (منزہ احتشام)، لہو لہو منظر (سلیم خان)، آخری بوند (توصیف احمد) کلشیے (خرم بقا)، خاک کی مہک (ناصر عباس نیر)، فرشتہ نہیں آیا، (ناصر عباس نیر)، اب صبح نہیں ہوگی (ابولیث جاوید)، ٹوٹی ہوئی سڑک (محمد جمیل اختر)، پرانے کپڑوں کا سوداگر (عبدالمتین جامی) کی اشاعت نے امید کو باقی رکھا ہے۔

اقبال حسن آزاد کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ان کا تازہ افسانوی مجموعہ 'پورٹریٹ' کی اشاعت نے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔اقبال حسن آزاد کے اس سے قبل دو افسانوی مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' ۱۹۷۷ء اور ''مردم گزیدہ'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔اب اقبال حسن آزاد نئے مجموعے کے ساتھ حاضر ہیں۔'پورٹریٹ' میں ۲۳/افسانے شامل ہیں۔اقبال حسن آزاد کے افسانے عام سماج اور عام آدمی کی عکاسی کرتے ہیں۔مجموعے کے کئی افسانے پورٹریٹ، گملے میں اگی ہوئی زندگی، جلتی ریت پر ننگے پاؤں سفر، بریکنگ نیوز، محبت، حصار، پھر کب آؤ گے، عمدہ افسانے ہیں۔

ڈاکٹر افشاں ملک کا شمار نئی نسل کی ان خاتون افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے اواخر میں اپنا سفر شروع کیا اور نئی صدی میں استحکام حاصل کیا۔افشاں ملک کا پہلا مجموعہ ''اضطراب'' شائع ہوتے ہی، ایوان ادب میں چھا گیا، 'اضطراب' میں افشاں ملک کے 16/افسانے شامل ہیں۔کتاب کے آخر میں اور فلیپ کور پر معروف افسانہ نگار اور اسکالرز نے افشاں ملک کی افسانہ نگاری پر عمدہ تجزیے کیے ہیں جن میں نجمہ محمود، شموئل احمد، نعیم بیگ، طارق چھتاری اور انجم عثمانی نے افشاں کے افسانوں کو موجودہ عہد کے افسانے کے لیے نیک فال بتایا ہے۔

مجموعے کے کئی افسانے' کاٹھ کے گھوڑے'، یاجوج ماجوج، گودلی ہوئی ماں، کلنک، گورِغریباں، سونے کا ڈھکن، سمندر، جہاز اور میں ایسے افسانے ہیں جو چونکاتے ہیں۔یہ افسانے مستقبل میں افشاں ملک کی شناخت بنیں گے۔

بزرگ افسانہ نگار مرحوم حسن نظامی کیراپی کا مجموعہ ''دعا کی قبولیت'' کی اشاعت بھی گذشتہ برس ہوئی۔حسن نظامی کیراپی کا تعلق جمشید پور سے تھا۔ان کا شمار بزرگ افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔وہ ایک خاص قسم کے افسانے تحریر کرتے تھے، جو حق پرستی اور حق وصداقت کو منظر عام پر لانے کا کام کرتے تھے۔مذکورہ مجموعہ ان کا آخری مجموعہ ہے۔اس سے قبل 'تحفہ' اور 'انشاءاللہ' نام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔'دعا کی قبولیت' میں تقریباً 46/افسانے اور 22/افسانچے شامل ہیں جب کہ صفحات 144 ہیں۔آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ افسانچوں کی طرح افسانے بھی مختصر ہیں۔دراصل یہ سب حالات حاضرہ اور انسانی اخلاق و کردار کے عکاس ہیں۔زیادہ تر افسانے، افسانہ نگار کے آس پاس وقوع پذیر ہونے والے سیاسی اور سماجی واقعات وحادثات کا موثر اظہاریہ ہیں۔

'لہولہو منظر' سلیم خان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔اس سے قبل بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ 'نیم چندن اور کوئل' شائع ہو چکا ہے۔سلیم خان کے زیادہ تر افسانے موجودہ سماج پر گہرا طنز ہیں۔وہ چھوٹے افسانے لکھنے کے عادی ہیں۔یوں بھی مختصر افسانے تحریر کرنا کوزے میں سمندر بھرنے کے مصداق ہے۔مجموعے میں ان کے تقریباً 20 افسانے شامل ہیں۔ان میں کئی ایک تو یاد رہ جانے والے افسانے ہیں۔لہولہو منظر، آخری قبر، مٹی کا رشتہ، بدنام گلی، سمجھوتا، خارزار کا مسافر وغیرہ۔حقانی القاسمی نے ان کی افسانہ نگاری پر بجا لکھا ہے:

''سلیم خان کی یہ مختصر کہانیاں آج کے عہد کے مسائل سے مکمل مکالمہ ہیں، یہ سیاست، سماج کی بے چہرگی، قدروں کے زوال، قدری ترجیحات کی تبدیلیوں کا مکمل بیا نیہ ہے، مہنگائی، بے روزگاری، تشدد، بدعنوانی، سیاسی مکروفریب جو آج کی عصری زندگی کا لازمہ بن چکی ہیں۔ یہ تمام موضوعات ان کی کہانیوں کا حصہ ہیں۔''

[حقانی القاسمی، فلیپ کور، لہولہو منظر، 2017، جلگاؤں، مہاراشٹر]

'اب صبح نہیں ہوگی' ابولیث جاوید کا چوتھا افسانوی مجمو عہ ہے۔ ابولیث جاوید اصلاحی فکر کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے انفرادیت کے حامل ہیں۔ اسلامی فکر، اخلاق و کردار، اسلامی طرزِ معاشرت پر ابولیث جاوید نے متعدد عمدہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کے تین مجموعے 'کانچ کا درخت'، 'کنا رے کٹ رہے ہیں، جاگتی آنکھوں کا خواب، منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے مثلاً 'چراغ کی لو، زبان یار من ترکی، نصیب دشمناں، اب صبح نہیں ہوگی، سناٹا بولتا ہے، پیچ تھری وغیرہ نہ صرف لیک سے ہٹ کر ہیں بلکہ ابولیث جاوید کی شناخت بھی ہیں۔ 'پیچ تھری' میں سپریم کورٹ کے ذریعے ہم جنسی کو غیر قانونی قرار دیے جانے کے بعد ہم جنس جوڑے کے ردعمل کو موضوع بنایا گیا ہے اور دورانِ افسانہ اصلاحی نقطۂ نظر اپناتے ہوئے مصنف نے قرآن کے قومِ لوط کے واقعے کو بھی پیش کیا ہے:

''ہزاروں سال قبل حضرت لوط علیہ السلام پیغمبر دین ہوئے تھے۔ ان کی گمراہ قوم نے انہیں جھٹلایا۔ حالانکہ لوط علیہ السلام نے قوم کو ڈرایا اور خود کو خدا کا امانت دار و رسول بتایا۔ قوم جو ایک نہایت ہی قبیح فعل میں مبتلا تھی اسے ترک کرنے کو کہا اور اپنی بیویوں سے رجوع کرنے کو کہا جو ان کے لیے حلال تھیں۔ قوم نے ان کی بات نہ مانی۔''

[اب صبح نہیں ہوگی، ابولیث جاوید، ص 142، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2017ء]

گلزار جاوید اپنے طرز کے انوکھے افسانہ نگار ہیں۔ بے باکی اور سلیقے سے بات کہنا، ان کا خاصا ہے۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''وہی خدا ہے'' ابھی شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل ان کے مجموعے ''خود ساختہ ناخدا'' کی اشاعت نے گلزار جاوید کی انفرادیت کا سکہ جما دیا تھا۔ گلزار جاوید، گذشتہ کئی دہائیوں سے ''چہارسو'' کے ذریعے ادب کی بے بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ''وہی خدا ہے'' کے افسانے اپنے پس منظر اور پیش منظر کے مطابق بولی اور زبان میں کچھ اس طور گندھے ہوتے ہیں کہ وہ ہر شخص کی کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ معروف فکشن نگار شموئل احمد گلزار جاوید کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''گلزار کے افسانے ذہن و شعور کی فنی جہت کی بازیافت کرتے ہیں۔ خارجی اور باطنی حقیقت کی عکاسی میں یہ افسانے گرد و پیش کی دنیا کے آئینہ دار ہیں۔''

[شموئل احمد، فلیپ کور، وہی خدا ہے]

'سنو کہانی، سنو کہانی' کے عنوان سے ایک بے حد خوبصورت کتاب دو جلدوں میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کو جامعہ ملیہ کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد اور ان کی ریسرچ اسکالر غزالہ فا

طمہ نے مرتب کیا ہے۔ بچوں کے لیے تحریر کردہ کہانیوں کے اس بے حد جامع انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو والوں کی بچوں کے ادب کی طرف رغبت میں اضافہ ہو۔ بچے ان کہانیوں کو پڑھیں تو ان کی اخلاقی تربیت عمل میں آئے۔ ڈاکٹر ندیم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دونوں جلدوں میں معروف قلم کاروں منشی پریم چند، احمد جمال پاشا، مشیر الحق،، سراج انور، غلام حیدر، عبداللہ دلی بخش، اطہر پرویز،، مسعودہ حیات، رشید احمد صدیقی، خلیق انجم اشرفی، زکی انور، عبدالستار صدیقی، آصفہ مجیب، صالحہ عابد حسین، سلام بن رزاق، مرزا ادیب، محمد مجیب، فیض احمد فیض، اشفاق حسین، حامد علی خاں، قاضی سلیم، شمیم حنفی، محمد طیب، صہبا لکھنوی، سیدہ سیدین، سید منیر الحسن، جیلا نی بانو، دولت خانم، غلام ربانی، خواجہ احمد عباس، راشد الخیری، مولوی عبدالحق، رابندر ناتھ ٹیگور، بیگم سلطا نہ حنفی، آمنہ ابوالحسن، رام لال، سری نواس لاہوری، یوسف ناظم، مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالحلیم ندوی، حیات اللہ انصاری وغیرہ تقریباً 144 مصنفین کی 195 کہانیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ کہانیوں کے انتخاب میں ترتیب زمانی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ویسے یہ کتب طالب علموں خصوصاً بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے دیباچے میں ان کہانیوں کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''کہانیاں پڑھئے تو موضوعات کی رنگا رنگی، مضامین کا تنوع، زبان کی سادگی، سلاست، بیان کی دلکشی، برجستگی، روانی، مکالموں کی برجستگی، ڈرامائیت، اور شگفتگی سے لے کر کہانی پن تک سبھی کچھ ان میں موجود ہے۔ کہانیاں کیا ہیں لطف و انبساط کا نگار خانہ ہیں۔ بیشتر سبق آموز کہانیوں میں اس خوبی سے سبق پڑھایا گیا ہے کہ سبق سے بھاگنے والے بچوں کو بھی اس بات کا احساس نہیں ہو پاتا کہ انہیں سبق پڑھا دیا گیا ہے۔''

[سنو کہانی، سنو کہانی، ڈاکٹر ندیم احمد، غزالہ فاطمہ، کتابی دنیا، 2017ء]

معروف افسا نہ نگار مرحوم نیر مسعود کا افسا نوی مجمو عہ 'گنجفہ' جسے پہلے ہی شہرت دوام حاصل ہو چکی ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز نے اسے نئے گیٹ اپ، خوبصورت سرورق اور کم وزن کاغذ پر شاندار طریقے سے شائع کیا ہے۔

2017ء فکشن تنقید

گذشتہ برس فکشن تنقید کے معاملے میں اچھا رہا ہے۔ اس سال کئی اہم کتب شائع ہوئیں۔ متعدد مونوگراف تحریر ہوئے۔ فکشن نگاروں اور فکشن ناقدین پر بھی کتابیں اور رسا لوں میں خصوصی گوشے شائع ہوئے۔ متعدد انتخابات بھی سامنے آئے۔

''کلیات سہیل عظیم آبادی'' کی شکل میں بہار اردو اکا دمی کا ایک فخریہ کا رنامہ سامنے آیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم گذشتہ کئی برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس کا سب کو بے صبری سے انتظار تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے سبھی افسانے تین جلدوں میں جمع کیے ہیں ساتھ ہی ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فنی بصیرت سے قلم بند کیا ہے۔

پرو دفیسر ارتضی کریم کی ایک اور کتاب ''سہیل عظیم آ بادی کے منتخب افسانے'' ادبی حلقوں میں ستائش کی نظروں سے دیکھی گئی۔ دراصل یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے ذریعے شائع

ہو نے والا مونو گراف ہے۔ کتاب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے 28 افسانے شامل کیے ہیں۔ ارتضیٰ کریم نے اس کتاب سے سہیل عظیم آبادی کے تعلق سے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان پر خواہ مخواہ ہمارے ناقدین نے پریم چند سے کلی طور پر متاثر ہونے کا دعویٰ کیا یا یہ کہہ دیا کہ پریم چند اگر پورے ہندوستان کے گاؤں کی تصویر پیش کر رہے تھے تو سہیل عظیم آبادی بہار کی دیہی زندگی کو اپنے افسانے کا موضوع بنا رہے تھے، اس لیے انہیں پریم چند کا پیروکار اور بہار کا پریم چند بھی کہا گیا۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہو سکتی ہے کلی اعتبار سے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے بہار اور چھوٹا ناگپور کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی ہے مگر ان کی کہانیوں میں پورا ہندوستان اور پورا انسان چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔''

[سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے، ارتضیٰ کریم، این بی ٹی، 2017ء]

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی دونوں کتاب، سہیل عظیم آبادی کے تعلق سے نہ صرف تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہیں بلکہ سہیل عظیم آبادی کے فکشن کی تفہیم و تعبیر میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

فکشن تنقید میں بشیر مالیر کوٹلوی کی کتاب ''گستاخی معاف'' نے خاصا ہنگامہ برپا کیا۔ کتاب کے عنوان سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ فکشن پر تنقید ہوگی۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے اردو کے معروف افسانوں 'بو'، ٹھنڈا گوشت، پھو جا حرام دا شہید سازی، بابو گوپی ناتھ، موذیل (سعادت حسن منٹو) پیتل کا گھنٹہ (قاضی عبد الستار) بین (احمد ندیم قاسمی) لاجونتی (راجندر سنگھ بیدی) لحاف (عصمت چغتائی) مہالکشمی کا پل ((کرشن چندر) کے تجزیے بالکل نئے انداز میں کیے ہیں بلکہ انہیں تجزیہ نہ کہہ کر افسانوی آپریشن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اسی مناسبت سے شاید انہوں نے کتاب کا نام ''گستاخی معاف'' رکھا ہے۔ انہوں نے برسوں سے چلی آ رہی ان افسانوں کی ساکھ اور عام تفہیم سے الگ، حقائق اور زبان کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض غلطیوں، خامیوں، بعید از قیاس باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ منٹو کے افسانوں کے ایسے متعدد گوشوں کی طرف انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کے ایک پہلو پر بشیر مالیر کوٹلوی کی رائے ملاحظہ کریں:

''تمہیں میری قسم.....بتاؤ! کہاں رہے.....؟
شہر گئے تھے.....؟'

یہ مکالمہ اپنی سمجھ سے باہر ہے۔ استاد نے (بشیر مالیر کوٹلوی، سعادت حسن منٹو کو اپنا روحانی استاد مانتے ہیں) پہلے ہی جملے میں بتا دیا کہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ہوٹل جن کے کمرے رہائش کے لیے کرایہ پر ملتے ہوں، وہ شہروں میں ہی ہوتے ہیں۔ کسی گاؤں میں ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ بھی نہیں کیا جا سکتا وہ بھی اس دور میں، جس دور میں افسانہ سانس لے رہا ہے۔ شروعاتی جملوں میں استاد واضح کر رہے ہیں۔ ''شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔'' یہ جملہ

خود اپنے اندر ایک بڑا ثبوت ہے کہ اس وقت
کلونت اور ایسشر شہر میں موجود تھے۔ پھر
کلونت کا یہ سوال کہ شہر گئے تھے...؟ بے معنی سا
لگتا ہے۔''

[گستاخی معاف، بشیر مالیر کوٹلوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس]

پروفیسر صغیر افراہیم فکشن تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ گذشتہ برسوں ان کی متعدد کتب فکشن تنقید کے حوالے سے شائع ہو چکی ہیں۔ ''پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ گذشتہ سال کے آخر میں ان کی اردو ناول پر ایک عمدہ کتاب ''اردو ناول: تاریخ، تعریف اور تجزیہ'' آ چکی ہے۔ موجودہ کتاب پریم چند پر ان کی اہم کتاب ہے۔ یوں بھی اردو فکشن میں پریم چند پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے مذکورہ کتاب میں پریم چند کے افسانوں، ناولوں اور دیگر تحریروں کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ پریم چند کے فکشن کے متعدد گوشوں کو سامنے لانے والی اس کتاب میں صغیر افراہیم نے پریم چند کی حب الوطنی کی طرف ٹھوس اشارے کیے ہیں۔ تحریک آزادی کے لیے وہ کس طرح نوجوانوں کے جذبے کو ابھارتے ہیں:

''پریم چند نے تیزی سے بدلتے ہوئے
حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوم کو
واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے
نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی
ہوئی صورت حال کا مقابلہ کریں۔ اپنی دھرتی
سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا
اظہار، پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے
علاوہ ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔''

[پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، پروفیسر صغیر افراہیم، علی گڈھ 2017ء]

''فکشن کا صغیر رحمانی (صغیر رحمانی کے افسانے)''

انجم پروین کی ترتیب شدہ کتاب ہے۔ ادھر ایک صحت مند رجحان یہ شروع ہوا ہے کہ نئی نسل کے بعض معروف افسانہ نگاروں کے حوالے سے بھی کام ہونے لگے ہیں۔ صغیر رحمانی، نئی نسل کے منفرد فکشن نگار ہیں جن کے ناول اور افسانے اپنے معاصرین سے نہ صرف الگ ہوتے ہیں بلکہ ان کا اسلوب انہیں بالکل واضح شناخت عطا کرتا ہے۔

انجم پروین نے صغیر رحمانی کے ۱۵/افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور ایک طویل اور بھرپور مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مقدمے میں انجم پروین نے صغیر رحمانی کے معاصرین کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ صغیر رحمانی کے فکشن کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

''انہوں نے جو کچھ لکھا اور جب لکھا وہ نہ تو ہوا
ئی قلعے ہیں اور نہ محض ذہنی اختراع ہے بلکہ
سماج کے ایسے کریہہ پہلو اور تلخ حقائق ہیں اور
وہ غلاظت ہے جس کی بساندھ پر لوگ ناک تو
بند کر سکتے ہیں اسے وہاں سے ہٹانے کی
جرأت نہیں کر سکتے۔ صغیر رحمانی کے قلم میں جو
نوکیلی دھار، ذہن میں جو تلملا دینے والا خیال
ہے جب یہ دونوں باہم ضم ہوتے ہیں تو ایسی
ایسی سفاک سچائیاں اور دلدوز واقعات و
حقائق بے نقاب ہوتے ہیں کہ انسانی ضمیر بھی
چند ثانیوں کے لیے جھنجھنا اٹھتا ہے۔''

[صغیر رحمانی کا فکشن، انجم پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017ء]

راقم کی کتاب ''اردو فکشن کے پانچ رنگ'' بھی اس سال شائع ہوئی ہے۔اس کتاب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچہ پر تفصیلی مضامین اور متعدد تجزیے شامل ہیں۔ پروفیسر ساغر برنی مرحوم کا تحقیقی مقالہ ''جدیدیت اردو افسانہ: بدلتی قدریں'' اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ کوشش کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

''اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار'' (جلد اول) اسماء نینی کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ کتاب میں نذر سجاد حیدر، خاتون اکرم، رشید جہاں، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین سے موجودہ عہد کی افسانہ نگار جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، نگار عظیم، ترنم ریاض، شائستہ فاخری تک تقریباً 26/خواتین افسانہ نگاروں کے بارے میں ہر ایک پر تین چار صفحات پر مبنی مختصر نوٹ شامل کیے ہیں۔ان میں زیادہ تر وہی نام ہیں جو اکثر اس طرح کی کتاب میں شامل ہو چکے ہیں۔

''حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات'' ڈاکٹر عشرت ناہید کی مرتبہ کتاب ہے۔ حیات اللہ انصاری کا شمار اردو کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانے کی عمدہ مثال حیات اللہ انصاری کے تمام افسانوں کو عشرت ناہید نے کتاب میں جمع کر کے اہم کام کیا ہے۔اس سے حیات اللہ انصاری پر کام کرنے والوں کو سہولت ہوگی۔

''انتظار حسین: حیات و فن'' ڈاکٹر نعیم انیس کے ذریعے مرتب کردہ کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل انتظار حسین پر مغربی بنگال اردو اکادمی کے ذریعے منعقدہ سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے جس پر ڈاکٹر نعیم انیس کا بھرپور مقدمہ شامل ہے۔ کتاب میں انتظار حسین کے فکشن اور تنقید کے مختلف گوشوں پر 26 مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ پروین کا تحقیقی مقالہ ''الیاس احمد گدی اور سنجیو کی ناول نگاری: تقابلی مطالعہ'' کتابی شکل میں سامنے ہے۔ڈاکٹر رضوانہ پروین نے بڑی محنت سے نہ صرف اردو اور ہندی کے دو ایسے ناول نگار جو ایک ہی علاقے اور ایک ہی عہد کے ہیں، کا تقابل کیا ہے بلکہ تقابلی مطالعے پر بھی خاصی بحث کی ہے۔ تقابلی تنقید کے حوالے سے ایک اچھی کتاب ہے۔

''اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'' دیپک پدکی کی ایک اہم کتاب ہے، دیپک بدکی، خود ایک معروف فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر مسلم افسانہ نگاروں پریم چند سے لے کر جوگندر پال، رتن سنگھ تک کے تمام افسانہ نگاروں کو شامل کیا ہے۔ ایک اچھی تحقیقی کتاب ہے۔

ادھر کئی اچھے مونوگراف معروف اردو فکشن نگاروں پر شائع ہوئے ہیں۔ جن میں الیاس احمد گدی (ڈاکٹر ہمایوں اشرف)، غیاث احمد گدی (ڈاکٹر نسیم احمد نسیم) دیویندر ستیارتھی (عبدالسمیع) خاص ہیں۔ مونوگراف کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیات کا ایک مختصر اور جامع محاکمہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

''صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور'' ڈاکٹر مظفر اقبال کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو کتابی صورت میں سامنے ہے۔ صغیر افراہیم معروف فکشن تنقید نگار ہیں۔انہوں نے پریم چند اور عہد پریم چند پر خاصا کام کیا ہے۔ان کی دیگر متعدد کتابیں بھی انہیں بحیثیت ناقد

مستحکم کرتی ہیں۔ادھر انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں جو گذشتہ برس ''کڑی دھوپ کا سفر'' مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور تنقیدی کارناموں کا ڈاکٹر مظفر اقبال نے سلیقے سے احاطہ کیا ہے۔

صادقہ نواب سحر، نے گذشتہ 12-10 برسوں میں بطور فکشن نگار اپنی مستحکم شناخت قائم کی ہے۔ان کی فکشن نگارشات پر ایک ضخیم کتاب ''صادقہ نواب سحر: شخصیت اور فن، فکشن کے تناظر میں'' پروفیسر میر تراب علی اور اسلم نواب نے ترتیب دی ہے۔ کتاب میں صادقہ نواب کے افسانوی مجموعے اور ناولوں پر مشاہیر کے مضامین، تبصرے، تجزیے وغیرہ شامل ہیں۔

''طارق چھتاری: کردار و افکار'' نئی نسل کے معروف ناقد ڈاکٹر راشد انور راشد کی نئے طرز کی کتاب ہے۔ڈاکٹر راشد نے بالکل منفرد انداز میں طارق چھتاری کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتاب تحریر کی ہے۔

''خالد جاوید: شخصیت و فن'' پر نوجوان ناقد محمد نہال افروز کی نہایت خوبصورت کتاب شائع ہوئی ہے۔نہال افروز نے سنجیدگی کے ساتھ خالد جاوید کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

''افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ (دہلی کے حوالے سے'' ڈاکٹر سرفراز جاوید کی تحقیقی و تنقیدی کتاب کا تیسرا ایڈیشن، عرشیہ پبلی کیشنز سے نئے گیٹ اپ میں شائع ہوا ہے۔

اسی سال اردو افسانوں کے دو اہم عالمی انتخاب شائع ہوئے۔ رابعہ الرباء نے اردو افسانے کا عالمی انتخاب کیا۔ دو جلدوں پر مشتمل اس انتخاب ''اردو افسانہ عہد حاضر میں'' کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔اس پر اعتراضات بھی بہت آئے کہ اس میں بہت سارے افسانہ نگار اس لیے چھوٹ گئے کہ انہیں خبر نہیں ہوئی اور مرتب نے اپنی سی کوشش کے بعد اسے شائع کر دیا۔لیکن اب اس کی تیسری جلد شائع ہونے والی ہے جس میں شاید فہرست مکمل ہو جائے۔ دونوں جلدوں کی مجموعی ضخامت ۷۰۰ صفحات کے قریب ہے۔

''امریکا میں اردو افسانہ'' مامون ایمن کی انتہائی اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ مامون ایمن نے بڑی محنت سے امریکہ میں رہنے والے تقریباً 45 ایسے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کیے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے امریکا پہنچے، یا جنہوں نے طویل عرصے تک وہاں قیام کیا۔ کچھ امریکی اردو افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ویسے زیادہ تر افسانہ نگار پاکستانی ہیں۔کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں افسانہ۔ افسانے کے موضوعات، کردار، پلاٹ وغیرہ کے تعلق سے بھی مامون ایمن نے خاصی بحث کی ہے۔ مامون ایمن نے افسانہ نگاروں کے احوال و کوائف کے علاوہ ان کا ایک افسانہ اور تجزیہ شامل کیا ہے۔امریکا میں اردو افسانے کے تعلق سے یہ اولین کاوش ہے جسے مثال پبلشرز ،فیصل آباد نے شائع کیا ہے۔ کتاب 1150 صفحات پر محیط ہے۔

2017ء کا ایک اہم واقعہ پروفیسر بیگ احساس کو ساہتیہ اکادمی انعام کا اعلان بھی ہے۔انہیں یہ انعام ان کے تازہ ترین افسانوی مجموعے ''دخمہ'' کے لیے دیا جائے گا۔ پروفیسر بیگ احساس اردو کے معروف فکشن نگار اور رسالہ 'سب رس' کے مدیر بھی ہیں۔ بیگ احساس کے افسانے انسانی اخلاق و کردار کے عروج و زوال کا نوحہ ہیں۔عصری حسیت کو فنی مہارت سے استعمال کرنا ان کا خاص وصف ہے۔

2017ء میں ادب میں ایک نیا معاملہ بھی سامنے آیا۔

ڈاکٹر ایم اے حق نے ''افسانچۂ اطفال'' کے نام سے بچوں کے لیے افسانچے لکھنے کی شروعات کی۔ افسانچے اور افسانچہ اطفال میں خاص فرق موضوعات اور اس کا طرزِ بیان ہے۔ شاعر نے اس پر خاص گوشہ بھی شائع کیا ہے۔

نوجوان صحافی و ناقد منصور خوشتر کی کتاب ''اردو ناول کی پیش رفت'' نے بھی خاصی دھوم مچائی۔ کتاب میں اردو ناول کی موجودہ صورت حال، موضوعات، کردار اور اہم ناولوں اور ناول نگاروں پر مضامین کے ساتھ ساتھ بعض ناولوں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ کتاب اکیسویں صدی میں اردو ناول کے ارتقا کو سمجھنے میں خاصی معاون ہے۔

2017ء میں بعض رسائل کے اہم شمارے اور گوشے فکشن نگاروں پر شائع ہوئے۔ غالب نامہ کا خصوصی نمبر ''قرۃ العین حیدر ایک منفرد فکشن نگار'' شائع ہوا۔ اس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقدہ بین الاقوامی ''قرۃ العین حیدر سیمینار کے مقالے شامل ہیں۔ یہ خاص شمارہ قرۃ العین حیدر کے فکشن کی تفہیم و تعبیر میں طلبا اور اساتذہ کے لیے خاصا مفید ثابت ہوگا۔

عالمی اردو ادب، دہلی نے انتظار حسین نمبر شائع کیا، ہماری آواز کا بھی تازہ شمارہ گوشہ انتظار حسین پر مشتمل ہے۔ مژگاں نے گوشۂ اسلم جمشید پوری شائع کیا۔ تحریک ادب کا صغیر افراہیم پر گوشہ شائع ہوا۔ زاویے کا خصوصی شمارہ مختصر افسانہ پر شائع ہوا۔ یہ رسالہ بریلی کالج کے شعبۂ اردو سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مدیران میں ڈاکٹر انوار وارثی اور ڈاکٹر شیویہ تر پاٹھی ہیں۔ ندائے گل پاکستان کا مائکرو فکشن نمبر شائع ہوا ہے جس میں مائکرو فکشن یعنی چھوٹی چھوٹی کہانیاں شامل ہیں۔

2017ء میں ہمارے کئی فکشن نگار ہم سے دائمی طور پر رخصت ہوئے۔ نیر مسعود (لکھنؤ)، بانو قدسیہ (پاکستان)، بلراج مین را (دہلی)، احمد جاوید (پاکستان)، اشفاق احمد (پاکستان)، ارشاد امروہوی (امروہہ)، حسن نظامی کیراپی (جمشید پور) وغیرہ اردو فکشن کی خدمت کر کے ملک عدم کو روانہ ہوئے۔

سوشل میڈیا پر فکشن

2017ء کو اس معنی میں مزید اہم کہا جا سکتا ہے کہ اس سال سوشل میڈیا خصوصا فیس بک اور وہاٹس ایپ پر فکشن کی دھوم مچی رہی۔ فکشن کے فروغ کے لیے متعدد گروپ سامنے آتے رہے۔ پہلے جو اردو افسانہ فورم تھا، وہ عالمی افسانہ فورم اور افسانہ فورم کی شکل میں آگے آیا ہے۔ اردو فکشن، قصہ کہانی، کہانیاں، عالمی افسانوی کارواں، انہاک فورم، کے علاوہ اردو نیٹ جاپان، شعر و سخن، اردو سخن، عالمی پرواز، ریختہ، اردو لائف ڈاٹ کام، اردو دوست ڈاٹ کام، دیدبان اور وہاٹس ایپ پر اردو فکشن، عالمی اردو پروفیسرز گروپ، دستک ادبی فورم بی ایچ یو، اردو اسکالرز گروپ، ضیائے حق اردو اسکالرز گروپ، ادب سلسلہ، نیا دور، قمر صدیقی، اردو چینل ڈاٹ ان، صرف ادبی خبریں وغیرہ پر پرانے شاہکار افسانے، ناول، موجودہ افسانے، افسانے اور ناول پر تنقید کی بھرمار ہے۔ وہاٹس ایپ پر پورے پورے ناول اپ لوڈ کیے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں منصور خوشتر، قمر صدیقی، راغب دیش مکھ، محمد علیم، صدف اقبال وغیرہ اور پاکستان میں اشرف شاد، سید تحسین گیلانی، حسیب اعجاز، دیگر ممالک میں صدف مرزا، سبین علی، وحید قمر، اسماء حسن، رابعہ الربا، سرور غزالی وغیرہ سوشل میڈیا پر فکشن کی تبلیغ و اشاعت میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اردو فکشن کا مستقبل بہتر ہے اور مزید بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔

OOO

بلراج بخشی

مضمون

حسی تجربوں کا شاعر.....خیالؔ

اِظہار انسان کی فطری جبلتوں میں سے ایک ہے اور کم و بیش ہر ذی روح میں کسی نہ کسی ابدائی حد تک ودیعت ہے۔ دراصل کسی بھی حیاتیاتی وحدے میں افزائش نسل کی مخفی جبلت کو مبادیاتی اظہار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ بنی نوع انسان میں اظہار کی جبلت کمال انتہا پر نظر آتی ہے اور کوئی بھی شخص اس سے محروم نہیں ہے۔ ازمنہ قدیم کے حجری دور میں غاروں کے باسی بھی دیواروں پر شکار کے مناظر مصور کر کے اظہار کے کرب سے مبرا ہونے کی سعی کرتے تھے اور بعد کو اظہار کی یہی روش علوم وفنون کا محرک بھی بنی۔

چندر بھان خیال نے نظم کو پیرایۂ اظہار بنایا ہے۔ غزل اور نظم میں سے نسبتاً کوئی بھی آسان صنف نہیں ہے۔ غزل محض قافیہ بندی نہیں ہے اور نظم کو محض منظوم بیانیہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غزل جامع اظہار کی صنف ہے جس کے دو مصرعوں میں ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور اس کے باقی اشعار میں کئی کائناتیں لرزاں دکھائی دیتی ہیں مگر خیالؔ کائنات کے کسی ایک ذرے کے اندر اتر کر راس کے اندرون کے انفجارِ گُل کا حصہ بن جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اصل میں غزل کا شعر کسی سریع الاثر نشے کی طرح فوری طور پر حواس کو متاثر کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے اردو شعری ذہن کو غزل کے دو مصرعوں ہی سے موزونیت ہے اور وہ اسی قلمرو میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ نظم چونکہ نہ صرف شاعر سے بلکہ قاری (سامع نہیں) سے بھی وسعتِ مشاہدہ و گہرے فکر کی متقاضی ہے اس لئے عام قاری نظم کے قعرِ عمیق سے بچ کر نکل جاتا ہے۔ خیالؔ کی شاعری کے اجمالی جائزے ہی سے عیاں ہو جاتا ہے کہ صنف غزل ہو یا نظم، خیالؔ کے شعری مبادیات اور تخلیقی سروکار انہیں فروعیات سے دور ہی رکھتے ہیں اور نظم میں تو ان کی فکر کی ریشگی اور فکری تفاعل اجتماعی عقوبت خانے سے فرار کی ایک بھرپور کوشش نظر آتی ہے۔ 'ڈریگن کے پروں پر' میں صدیوں کی کوششوں کے باوجود مرد عورت کے تصور وسحر سے باہر نکل ہی نہیں پاتا اور یہ ایک نیچرل فینامنا ہے جسے معاشرہ صدیوں سے پاکبازی کے نام پر ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ع

یہ جزیرہ ہے کہ زہرہ
اس کے پتھر ہیں کہ گوہر
گوہروں کے ڈھیر پر ننگی کھڑی عورت
حقیقت ہے کہ سپنا

خواہشوں کا ناگ پھن کاڑھے کھڑا ہے
چھٹپٹاتا ہوں کہ جیسے
وِش اگلنے کے لئے سر پھوڑتا ہو کوئی وِشدھر

'گناہوں کے ٹیلے پر'، 'زندانی' اور 'آنچ کا بستر' میں بھی اسی کیفیت کا اظہار ہے۔ خلوتوں میں جاکر رگوں کی آگ بجھانے کی خواہش، جنگل کا سلگنا اور دریا کا ابلنا اس بات کی غماز ہے کہ ایک فطری جذبے اور عمل پر معاشرے کی طرف سے کتنی غیر فطری قدغنیں لگا دی گئی ہیں۔ ان کی نظموں ''میٹھی موت کا رقص''، 'وقت کی آنکھیں'، 'کوشش رائیگاں'، 'گناہوں کے ٹیلے پر' میں بھی، ننگی عورت کی جانگھیں، کھونٹی سے لٹکی شلواریں، جسموں کے تہ خانوں جیسی لفظیات اور بار بار پھن کاڑھتے ہوئے سانپ کا استعارہ انسان کے اندرون کی وحشتوں اور فنطاسیوں کی دنیا میں اخفا خلفشار کو واشگاف کرتا ہے۔

چندر بھان خیال اپنے شعری رویوں پر بڑے اعتماد

سے قائم ہیں۔ان کی نظمیں باقاعدہ بحروں، مروجہ اسالیب اور ہیئتوں میں ہیں جبکہ بہتیرے جن کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اور وہ محض چونکانے کے لئے جدیدیوں کے وضع کردہ تشکیک، تنہائی، اقدار کی شکست وریخت جیسے کوکو اور بوئی قسم کے non-subjects جن کا برصغیر کے معاشروں میں کوئی وجود نہیں، کو لے کر نثری نظم اور آزاد غزل وغیرہ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔گزشتہ دنوں کوئی یک مصرعی نظم کی بات کر رہا تھا۔

چندر بھان خیالؔ کی نہ صرف نظموں، بلکہ غزلوں میں بھی سانپ ایک نمایاں استعارے کے طور پر ابھرتا ہے۔سانپ کے ساتھ ساتھ پتھر، پریت، سانپ، رات، پشاچ، جادوگر، جنگل کی سائیں سائیں، گپھا، ناگن' جیسی لفظیات جنگل کا ماحول خلق کرتی ہیں۔اور اس ماحول میں 'جنگ بھیانک سُرتالوں میں'، چاقو تیغ بھالے، سرخ شراب کے ساغر، اور سیاہ جسم کی عورت کی انگڑائی، آسیب زدہ رات کا سناٹا، سانپ، اجگر اور انتہائی بے بسی کا احساس جنگل کی ہولناکیوں کے ساتھ نباہ کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔حالآنکہ وہ غاروں اور جنگلوں سے نکل آئے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ جنگل کی تہذیب کے ساتھ ان کی شیفتگی انہیں لاشعوری طور پر haunt کرتی ہے یا پھر وہ آج بھی کسی نہ کسی سطح پر ڈر اور خوف کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔خیالؔ کی شعری وحشتیں، دشت میں کسی الاؤ کے لرزتے ہوئے شعلوں کی مظہراتی، واقعاتی وتاثراتی عکاسی پر باطن میں تجسّر سایوں کو پرت در پرت کھولتے ہوئے بھی واشگاف نہیں ہونے دیتیں اور جنگل کی ہیبت اور خوف قاری کو ایک مناسب فاصلے ہی پر رکھتا ہے۔ یہ خیالؔ کی مخصوص استعاراتی فضا ہے جو ان کے شعری پس منظر میں اپنے طلسم کا احساس کرواتی رہتی ہے۔

چیختی ہے روح میری آج بھی مجھ سے پرے
جیسے میلوں دور جنگل سے کوئی آواز دے

جیسے بوڑھا سانپ ہو بیتاب اڑنے کے لئے (رات کی بوجھل اداسی)

'ازل تا ابد'، 'تیسری دنیا کا درد' جیسی نظموں میں گوہروں کے ڈھیر پر ننگی کھڑی عورت، بیوی کا دہکتا پاک جوبن جیسی لفظیات عورتوں کی پامالی اور استحصال کا استعاراتی بیان ہے۔

'شہر اور میں' شہروں کی جانب مسلسل انخلا کا نوحہ ہے۔گاؤں سے شہر کی جانب ہجرت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ گاؤں میں مواقع مفقود ہیں اور تعلیم کے پھیلاؤ کی وجہ سے لوگوں میں نئے آفاق کی حصولیابی کے شدائد انہیں ہجرت پر اکساتے ہیں پر شہر کچھ نہیں دے پاتا۔ایسا لگتا ہے کہ شہر کی جہد مسلسل کی ضابطہ بندیوں سے تنگ آکر جہد گر اپنے ارمان، پیمان، جسم، جان لے کر پھر جنگل کے اسی ماحول میں لوٹ جانے کو مجبور نظر آتا ہے۔(پریت پوجا) 'نئی روشنی کے خواب' میں خیالؔ تیقن سے کہتے ہیں کہ اگر ہم عقیدے کے بھروسے پر روشن مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں تو ہم غلطی پر ہیں۔

کوئی چپکے سے کہتا ہے/ننگی عورت کی جانگھوں میں
سانپ ڈال کر میں سو جاؤں/لیکن کوئی چیخ رہا ہے
/وقت کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں/ لمحہ لمحہ خونیں
خنجر/صدیاں جیبھیں ہیں سانپوں کی (وقت کی آنکھیں)

آسیب زدہ رات کا سناٹا، سانپ اجگر، اور انتہائی بے بسی کا احساس:

بھیڑ لوگوں کی ابھی تک ہے اسی الجھن میں/زہر
احساس کا پی لیں کہ اگل دیں اس پر/ جو ہے شِولنگ
کی مانند سمادھی میں مگن (اور وہ آج بھی....)

ہرنیاں، جنگل، دلدل، بھیڑیئے، سانپ، وحشیوں کے نتھنوں سے ٹکرانے والی نرم گوشت کی بُو، وِش کنیا، دیوداسی (خاموشی کا درد) اور 'مداوا' بھی عورت کے ازلی عورت پن کی ازلی بے بسی ہے۔'عذاب در عذاب' میں بھی اک اجتماعی جبر کے

درد پیہم کے کابوس سے پھٹ کر نکل جانے کی شدید خواہش اور چھٹپٹاہٹ تو ہے پر اجتماعی جبر سے فرد کے بچ کر نکل جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور چندر بھان خیالؔ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اس خوش فہمی سے بھی نکل جاتے ہیں جب دور دور تک مساوات آ گیں معاشرہ پیش نگاہ نہیں ہوتا۔'اب نہیں تم تو' اور 'نیوٹرون کا داخلہ' میں بھی یہی صورت حال ہے۔

دراصل معاشرہ فرد سے ہمیشہ اپنے حق میں دستبرداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ حالآنکہ یہ مطالبہ تحریری نہیں ہوتا مگر دباؤ اتنا شدید ہوتا ہے کہ فرار ممکن نہیں ہو پاتا اور تخلیق کار انقباض کی گرفت میں آجاتا ہے۔ چندر بھان خیالؔ کی امن کی دیوی کا قتل، ہم نہرو کی سنتان، ایک معتبر نام، پاکستان سے آنے والوں کے نام، قتل پھر گاندھی ہوا، قسم کی نظمیں ان سے معاشرے کے اجتماعی جبر کے تحت لکھوائی گئی محسوس ہوتی ہیں۔ نظموں کے عنوان ہی سے ان کی مجبوری عیاں ہے اور دکھائی دیتا ہے کہ ارباب اقتدار جبری مشقت کے لئے ان کے تعاقب میں ہیں۔ اسی طرح، کہاں جائے گا، لنگڑی راتوں کے مسافر، طغیانی اور اس جیسی دوسری بلند آہنگ سیاسی نظمیں دراصل معاشرے کے کتنے شدید جبر کے تحت لکھی گئی ہوں گی، آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ وہ دور 1975 کے بعد کا تھا۔

شاعر چونکہ معاشرے کا ایک باشعور رکن ہے اور معاشراتی سروکار اسے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی متاثر کرتے ہیں لیکن عصری مسائل کی صحافیانہ ترجمانی کو کسی بھی طور درست شعری رویہ قرار نہیں دیا جاسکتا جیسا کہ بیشتر شعرا کے ہاں اکثر اس حد تک دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری اخبار کی سرخیوں ہی کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ شاعری نہ تو معاشرتی مسائل کا بیان ہے اور نہ ہی شاعر کوئی اصلاحکار ہے۔ لیکن کوئی بھی شاعر اپنے عصر سے بے خبر رہ کر اپنے لیے غیر مرئی دنیا خلق نہیں کرسکتا۔ چنانچہ چندر بھان خیالؔ اپنے عصر سے پہلو تہی نہیں برتتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے شعر اخبار کی شہ سرخیاں نہیں ہوتیں، نہ ہی ماضی کی بازیافت یا مستقبل کے لئے وہ کوئی اکسیر وضع کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کی حمایت یا مخالفت میں نعرے لگاتے ہوئے نظر تو نہیں آتے لیکن گیسوئے شمع ہمیشہ ان کے عینی حافظے میں رہتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں: ع

انہیں مندر بنانا ہے انہیں مسجد بچانا ہے
کوئی سنتا نہیں ان کی جنھیں اک گھر بنانا ہے

میرے آگے نہ تھا راستہ کوئی بھی
میرے پیچھے مگر لوگ سارے چلے

میں کبھی ہندو کبھی مسلم کبھی عیسائی ہوں
میرا ماضی ہے نہ مستقبل کروں تو کیا کروں

چلو چلتے ہیں پھر جنگل کی جانب لوٹ چلتے ہیں
یہاں تو بھیڑ ہے دم گھونٹنے والا ٹھکانہ ہے

چندر بھان خیال اپنے جذبات، احساسات و تجربات کو شعر میں ڈھالنے کے فن سے واقف ہیں۔ انتخاب موضوع یا ترسیل معنی ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کی زبان و بیان کی روانی اور سلاست ان کی شعریات کا وصف ہے جو قاری کے دل کو فوری طور پر متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ کمال سادگی سے اپنی بات بیان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔: ع

اسلوب تراشیں گی ابھی آہنی گھڑیاں
کام آئیں گے پھر جا کے نگینے کے لئے ہم

ملتا نہیں خود اپنے قدم کا نشان مجھے

کن مرحلوں میں چھوڑ گیا کارواں مجھے

پھر رنگ سے خالی یہ فضا رہتی ہے برسوں
یوں سیر کو آئے ہیں مہینے کے لئے ہم

تواریخ کے تمام عہد شکست و ریخت، خوف و ڈر کے عہد رہے، زمانہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے، معاشراتی، معاشی، سیاسی منظرنامہ بھی وہی ہے۔ خیالؔ اس حقیقت سے واقف ہیں اور اسی لئے تشکیک، تنہائی، انہدام، شکست جیسے علائم نہ ہونے کے باوجود ان کا لہجہ نیا اور منفرد ہے۔ وہ نہ صرف جدیدیت کی آلودگی سے مبرا ہیں بلکہ کسی بھی طرح کے شعوری یا بصری التباس کے بغیر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے ہیں۔ ع

میرے باطن میں چھپا بیٹھا ہے اک شہر فساد
جانے کیا سوچ کے لپٹا ہے بیاباں مجھ سے

نگاہ و دل سے مٹا دیں جو تشنگی کا عذاب
وہ آبشار کے دھارے ابھی کہاں گزرے

ہم تو نا کردہ گناہوں کی سزا کہتے ہیں
زندگی تو بھی بتا دے تجھے کیا کہتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں حسی تجربے، ارضی سروکار زیادہ ہیں۔ چندر بھان خیالؔ کے حسی تجربے شاعری کے معنوی پہلوؤں کو وسعت دیتے ہیں۔ زندگی کے رویے جو کبھی مثبت ہوتے ہیں کبھی منفی اور دونوں فنکار کے ذہنی، داخلی اور ادبی رویوں میں بازیافت ہوتے ہیں صرف فروغ شعلۂ خس کی طرح نظر آ کر قاری کو فکر کے اس شعلۂ التہاب کے تعاقب کی انگیخت کرتے ہیں۔ چندر بھان خیالؔ کی شعری کائنات میں داخلی معنویت، توانائی اور زندگی کے کئی شیڈز نظر آتے ہیں اور ان کی معنی بردار علامتیت ان کے تخلیقی تفاعل کو مکشوف کرنے کے بجائے مستور کر دیتی ہے۔

دراز گیسوئے پرخم، بلند قامت ناز
اب اور اس سے بڑی کائنات کیا ہوگی

سانپ سے لپٹا چلا جاتا ہے حسن بے حجاب
یہ طلسمی رات وحشت آفریں پہلے نہ تھی

صرف اک حد نظر کو آسماں سمجھا تھا میں
آسمانوں کی حقیقت کو کہاں سمجھا تھا میں

چندر بھان خیالؔ کی شاعری دراصل اظہار کے کرب سے نجات حاصل کرنے اور وسیع و عریض کائنات میں اپنے مقام کے تعین کی کاوش ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ کاندھے پر لٹکے تھیلے میں کوئی نجات کوش نظریہ لے کر راستے میں ملنے والے مستحقین میں تقسیم کرتے ہوئے چل رہے ہیں بلکہ وہ تو خود متجسس آنکھوں سے دنیا و مافیہا کو دیکھتے ہیں اور اس میں خود کو تلاش کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں تاکہ کائنات اور کائنات میں اپنے وجود کے جواز کا تعین کر سکیں۔ اس کاوش میں وہ اندیکھی خلاؤں میں کھو کر بھی گھبراتے نہیں بلکہ ان کشادگیوں اور وسعتوں میں اپنی بازیافت کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں جیسے کوئی انسان کسی ہیبتناک خواب سے باہر نکلنا چاہتا ہو۔

چندر بھان خیالؔ کا شعری رویہ دراصل ذات و کائنات میں تطابق کی تفہیم کی سنجیدہ کوششوں سے مرتسم ہے۔

رعائتی نرخ پر

ادیبوں و شاعروں کی کتابوں کے اشتہارات
''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

مضمون

رتن لعل ہانگلو کی نظمیہ شاعری کی معنویت واہمیت

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اس مابعد جدید تناظر میں پروفیسر رتن لعل ہانگلو ایک قابلِ ذکر وفکر دانشور نظم نگار ہیں۔انھوں نے زندگی کے نت نئے تجربات ومشاہدات اور جذبات واحساسات کو نظمیہ شاعری کے پیکر میں ڈھال کر نہایت ہی فنّی بصیرت اور فنّی ذہانت کے ساتھ بہت ہی سادہ، سلیس اور آسان زبان میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرنے کا ہنر پروفیسر رتن لعل ہانگلو بخوبی جانتے ہیں۔ان کی نظمیہ شاعری میں غیر معمولی مُورِّ خانہ سماجیاتی بصیرت، گمبھیر سنبھلی ہوئی شعریت اور نازک ترین دردمندانہ انسانی حسیت روشن، منوّر اور فروزاں ہے۔

''رحمتِ باراں'' اگر آئے تو پھر نکھرے چمن
''کوئی پَو پھوٹے کہیں سے، ہے تتلیوں کو انتظار
(میرا ہندوستان)

ان کی نظمیہ شاعری رحمتِ خُداوندی، فطرت کی چمن پسندی اور انسان دوستی کی حسین وزرّیں سازینہ ہے۔سمفُنی ہے جو ہمہ جہت نا اُمیدی کے بجائے اُمید پسندی، ہمہ رُخی نفرت کے بجائے دِلنواز محبّت آفرینی، ہمہ پہلو بے یقینی کے بجائے غیر معمولی یقین آفرینی اور ایمان افروزی کی زمزمہ سنج ہے۔

''سازِ نغمہ'' لے کے اب محفل میں گاؤں غزل
''داستانِ گلستاں'' ہے چشمِ نم اب زار زار
پھر سے پر پھیلا کے ٹہنی کا سہارا لے کے سب
شوق سے اب چہچہائے، گنگنائے بار بار
پو پھوٹنا، تتلیوں کا انتظار کرنا، شاعرِ خُوش نوا کا سازِ نغمہ لے کر گلستاں میں گانا اور بُوستاں کے چشمِ نم کو پونچھنا اور پرندوں کو ذوق وشوق سے چہچہانے اور گنگنانے کی دعوتِ تخلیق، تشکیل اور تعمیر میں غیر معمولی تصوّرِ حسن، تصوّرِ صداقت اور تصوّرِ نور کارفرما ہے۔ اس نظم میں دانشور شاعر کی غیر معمولی دردمندانہ وطن دوستی ہی نہیں، انسان دوستی اور آفاق دوستی پوشیدہ ہے۔

پروفیسر رتن لعل ہانگلو کی بیک وقت دانشورانہ شاعرانہ ''حسرتیں'' میں ہر جگہ خوابناک، تعمیر پسند، مستقبل بیں اور مُستقبل جُو یا ''دوسری دُنیا'' کا دیدہ ورانہ رُویا (VISION) حُسن آرا اور معنی آرا ہے۔ہانگلو اپنے سماج، تہذیب، ثقافت اور تواریخ کی اس ٹھوس مادّی دُنیا کے عام آدمیوں کے مانند آنکھیں موندے سرسری نہیں گزرتے ہیں جیسا کہ خُدائے سُخن میرؔ نے فرمایا ہے:

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا ''جہانِ دیگر'' تھا

وہ محض تواریخ داں، تہذیب دانِ، ثقافت داں ہی نہیں بلکہ ایک مسلسل تبدیلی پسند، مستقبل بیں، مستقبل شناس اور مستقبل سنج دانشور سخنور بھی ہیں۔ان کی نظم نگاری میں اعلیٰ سنجیدگی، تہذیبی کیف وکم اور غیر معمولی فکریاتی وِقار و وزن ہے۔ان کی رمزیاتی نظمیہ شاعری کی رَینج نہایت وسیع اور رفیع تر ہے۔ وہ مُقامیت، علاقائیت سے گزر کر بے اِختیارانہ آفاقیت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ ان کا وسیع اور رفیع تر دانشورانہ شاعرانہ خوابِ عرفان (VISION) ان کے بیکراں ذاتی غم و الم کا اِرتفاع کر اس کو نہایت حسّاس دردمندانہ سطح پر آفاقی (UNIVERSAL) بنا دیتا ہے۔ان کی ذاتی کہانی رام کہانی بن جاتی ہے۔''رُودادِ جہاں'' بن

جاتی ہے:

میں بڑا ساگر نہیں، ''ندی کی پیاس'' ہوں
ایک گرتے اشک کے پیچھے، بُنا احساس ہوں

''ندی کی پیاس'' اور ''ایک گرتے اشک'' کے پیچھے کار فرما شدید احساس کی بُناوٹ (TEXTURE) اور بَناوٹ (STRUCTURE) کے باعث ان کی غیر معمولی ہمدِلی (EMPATHY)، ہم روحی، ہم جانی اور ہم قلبی شراکت اور رِفاقت کی توفیق (GRACE) کو خاطر نشیں کیجئے:۔

دوستو ! مذہب بھی ہے اپنی جگہ
انسانیت کو بھی جگہ اب دیجئے
ہے بڑی تہذیب گنگا کی، اِدھر
دیش کا ہی آبِ زم زم پیجئے

اس مُثبت (POSITIVE) ذہنی رواداری، کشادہ دلی اور زندگی باری کے انسان نواز رویّہ اور انسانیت پرور برتاؤ کا امین ان کا نظمیہ حسن پارہ ''یہ زندگی'' کا اولین بے ساختہ غَنائیت آفریں مصرعہ ہی حسّاس اور صاحبِ دل قاری کو بیک وقت ذہنی اور قلبی کیف سرمدی عطا کرتا ہے۔

''لے پکڑ اب جام اور اب تھام لے یہ زندگی''

''یہ زندگی'' کے مزید معنی آ گیں اور چشم کُشا دو بند آپ بھی خاطر نشان فرمایئے اور خصوصی طور پر آزاد نظم کی ہیئتی اور ساختیاتی نُدرت آفرینی سے لطف اندوز ہوئیے۔ وہ تخلیقیت آفریں، تخلیقیت پرور اور تخلیقیت افروز تجربہ پسند شاعر ہیں جو ہزار شکستِ خواب کے باوجود ایک اور خواب دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

لے پکڑ اب جام اور اب تھام لے یہ زندگی
کون سی جنّت میں جائیں، کیسے دوزخ میں مریں
یہ خیالوں کی وراثت لے کے ہم کب تک جیئں
کس کو سمجھاتے پھریں، بدنام ہے یہ زندگی
لے پکڑ اب جام اور اب تھام لے یہ زندگی
کیوں کوئی مر جائے اس عالم میں اے عالم پناہ
بے گناہ بیزار ہے، بے عار کیوں ہوتے فنا
تیری دُنیا میں صرف قِمام ہے یہ زندگی
لے پکڑ اب جام اور تھام لے یہ زندگی

اُن کی نظم ''دُنیا'' کا یہ برجستہ بے پناہ حسین و زرّیں مصرعہ بے اختیار حسّاس روح کا زندہ اور دھڑکتا ہوا حصّہ بن جاتا ہے اور صرف دُنیا ہی نہیں بلکہ ماورائے دُنیا کے حجابات کو اُٹھا دیتا ہے:

''یہ دُنیا صرف ایک محض رقص گھر ہے''

ہانگلو صاحب کی نظمیہ شعریات محض کشمیر یات اور جمالیات کو ہی برانگیختہ نقاب نہیں کرتی ہے بلکہ قدریات (AXIOLOGY)، علمیات (EPESTIMOLOGY)، وجودیات (EXISTENCE) اور عرفانیات (ONTOLOGY) کا اشارہ کُنندہ ہے۔ اس ضمن میں ''وقت''، ''اے روشنی''، ''احساس''، ''سُراب''، ''پیلا رنگ'' اور ''کیوں؟ قابلِ قدر اور قابلِ مُطالعہ منظومات ہیں۔

وہ تھکے بازار اور بے انتہا دشت کار
وہ علم و ہنر اور وہ قومی صلاح کار
وہ آزاد سوچ اور نو جوانِ ہمت دار
وہ صلاحیتیں اور وہ بلند کردار کیا ہوا !
بس سب کے سب دب گئے ایک پیلے رنگ کے تلے

(پیلا رنگ)

خاک تو خاک ہے لیکن ہے مُیسّر سب کو
اس لئے ہم کو موتیوں کی مالا بنانا کیوں ہے؟
کیا کہیں بکتا ہے ''برداشت'' دلاؤ ہم کو
ورنہ ہم کو بھی بتاؤ، خود کو بھلانا کیوں ہے
(کیوں؟)

آشنا ہو تم میرے جلوؤں کے بعد اے روشنی
تو کہاں تھی اور کہاں ڈھونڈھا تجھے اے روشنی
تم اندھیروں کو سمیٹو اپنے دامن میں کبھی
پھر نظر آ جائیں گے ابھرے دبے اے روشنی
ویسے تو کالی گھٹائیں دہر میں چھائی رہیں
کر گئی مجھ کو منور بس خیالِ روشنی
جب پڑی اس پری پیکر پہ میری ایک نظر
سبز رنگی کر گئی صحرا کو تو اے روشنی
(اے روشنی)

اُن کی ''فریب شکستگی'' کی حامل نظمیہ صداقت پارہ ''میرا جشنِ وفات'' وجودیات اور عرفانیات کا مکاشفہ ہے۔ بند ملاحظہ فرمائیں:

کوئی نہیں تھا میرے سوا میرے کفن کے ساتھ
سب لوگ کیوں منا رہے ہیں میرا جشنِ وفات
کچھ لوگ رو پڑیں گے ممکن ہے یہ ضرور
کچھ خواب سی دُنیا کا لائیں گے پھر شعور
کچھ غم بھلانے کے سبب میں مبتلا رہیں
لیکن وہ دہرائیں گے پھر ساری وہ روایات
کوئی نہیں تھا میرے سوا میرے کفن کے ساتھ
سب لوگ کیوں منا رہے ہیں میرا جشنِ وفات
حیرانیوں کا مجھ کو اکیلے پتا چلے
جب خون اور جسم کے ریشے اس آگ میں جلے
وہ دھواں وہ شعلے وہ راکھ اور وہ سونا پن
لے کر چلوں گا میں اکیلا اس وفات کی رات
کوئی نہیں تھا میرے سوا میرے کفن کے ساتھ
سب لوگ کیوں منا رہے ہیں میرا جشنِ وفات

ان کی شاہدانہ ہوش و آگہی (ساکچھی) آتش کدہ میں بھی قائم و دائم ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر رتن لعل ہانگلو کی غیر معمولی فکر انگیز، معنی خیز اور بصیرت افروز نظمیہ مجموعہ کلام ''حسرتیں'' کی تمام نظمیہ شاعری لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور قاری کو بہت کچھ سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اس مابعد جدید دور میں ہانگلو صاحب کی غیر معمولی نظمیہ شاعری معنویت اور اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم ان کا نظمیہ مجموعہ ''حسرتیں'' بدترین پروف ریڈنگ کا المیہ ہے۔ ''تعارف نامہ'' کل کل کانٹا ہے۔

OOO

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

محمد عرفان

مضمون

''جذبی کا تصورِ حسن و عشق''

بیشتر کلاسیکی شاعروں کی طرح جذبی کی شاعری کی ابتدا بھی رومانی شاعری سے ہوتی ہے۔ ابتدا میں داخلی کیفیات کا عمل زیادہ نظر آتا ہے۔ نوعمری میں عشق و محبت کے جو غیر تسلی بخش جذبات و احساسات انسان کے اندر فطری طور پر پائے جاتے ہیں جن پر وہ کسی طرح کی پابندی پسند نہیں کرتا، وہ سارے جذبات و احساسات جذبی کی ابتدائی دور کی شاعری میں صاف محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں نوجوان دلوں کے جذبات و احساسات، واردات عشق اور دیگر تجربات کے عناصر نظر آتے ہیں۔ دراصل اردو کی کلاسیکی شاعری کی روایت رہی ہے کہ حسن و جمال کو محض عاشقانہ تصور کیا گیا۔ جب کہ اس کا کینواس اتنا وسیع ہے کہ یہ تمام زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ابتدا میں جذبی بھی اسی بیماری دل کے مریض ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اپنے مضمون ''معین احسن جذبی: اپنی فکر و فن کی دنیا میں'' میں لکھتے ہیں کہ ؎

> یہ دور اردو شاعری میں رومانیت کے وفور و نشور کا دور تھا۔ بہت سے فنکار کیف و سرمستی کے آغوش میں پناہ لینے کے مشتاق تھے۔ اقبال کی نوائے سینہ تاب حساس دلوں میں جوشِ نمو اور ذوقِ انقلاب پیدا کر رہی تھی، لیکن رومان پسند سخن ور چاند جیسے طلسمی جزیروں میں پناہ لینے کے آرزو مند تھے۔ اختر شیرانی، جوش مجاز، سب کی نگاہیں مطربہ، مالن، رقاصہ وغیرہ پر بار بار جا کر اٹک جاتیں۔ جذبی بھی اس دھندلکے سے دامن نہ بچا سکے۔'' [1]

جذبی کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی محبوب کے تھرکتے ہوئے پاؤں پر عشق و محبت کے نغمے گنگنائے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کا آغاز بالکل کلاسیکی اور روایتی انداز میں اساتذہ کے رنگ میں کرتے ہیں اور

[1] آج کل، اگست 1994، ص: 41

کرتے بھی کیوں نہ جب کہ وہ دور کلاسیکیت سے عبارت تھا۔ میر تقی میر محبوب کی پاک دامنی کا خیال اور عشق کا لحاظ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اسی خیال کو جذبی کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

تیری رسوائی کا ہے ڈر ورنہ
دل کے جذبات تو نہیں محدود

عشق میں جفا کاریوں اور تغافل کے بعد محبوب کے احساسِ انفعال کا مضمون غالب کے یہاں کچھ یوں ملتا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جذبی اسی مضمون کو کچھ اس طرح باندھتے ہیں:

نگاہِ یاس نہ شرمندۂ جفا کو چھیڑ
یہی بہت ہے کہ وہ آج شرمسار تو ہے

یہ امر مسلم ہے کہ احساسِ حسن و عشق سے کسی انسان کا دل خالی نہیں۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو فطری طور پر ہمیں اپنی طرف

کھینچتا ہے۔ روز ازل سے لے کر آج تک یہ ہمارے دلوں کو تڑپاتا رہا ہے اور تڑپاتا رہے گا۔ بقول عبادت بریلوی ؎

'' انسان کے اندر حسن کا احساس بالکل فطری ہے، آدم سے لے کر اس دم تک کوئی دور یا کوئی ملک ایسا نہیں ملتا جو حسن کے احساس سے بیگانہ ہو یا انسان نے حسن کے اثرات قبول نہ کیے ہوں اور حسن کی ماہیت کا پتہ لگانے کی کوشش نہ کی ہو۔''[1]

جذبی خود لکھتے ہیں ؎

رہے حسن و عشق کے خالص انفرادی جذبات، سوان کے متعلق صرف یہ عرض کروں گا کہ ازل سے لے کر آج تک یہ دلوں کو گرماتے رہے ہیں اور گرماتے رہیں گے۔''[2]

اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حسن و عشق کیا صرف اس کے ظاہری حسن لب و رخسار، چشم و برو، خال و گیسو، بل کھاتی ہوئی کمر اور تیرِ نظر یا اس کے گداز جسم میں ہی پوشیدہ ہے؟ اگر ہاں تو پھر اس کے باطنی حسن وفا شعاری، ایثار و محبت، شجاعت، صبر و تحمل اور اس کی بے لوث مامتا کو کس خانے میں رکھیں گے۔ دراصل ہمارے اردو کی کلاسیکل شاعری میں حسن و عشق کو محض محبوب کے لب و رخسار تک ہی محدود رکھا گیا جو کہ حسن کی بہت ہی سطحی تعبیر ہے حسن کی مختلف جہتیں ہیں اور اس کی مختلف و متنوع تعبیرات و تشریحات پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر شارب ردولوی کچھ یوں رقم طراز ہیں ؎

''بہر حال حسن کی اب تک جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان میں بہت سی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عقل اس کے بارے میں کچھ کہتی ہے۔ محسوسات اور وجدان اسے کچھ بتاتے ہیں۔ شاعر اور صوفی اس کی کچھ تعریفیں کرتے ہیں۔ تصور پرست حسن کو ایک تصور، مادہ پرست ایک تناسب اور توازن اور اخلاق پرست خیر محض کا نام دیتے ہیں۔''[1]

بعض مفکرین کی نظر میں حقیقت اور حسن ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ جس چیز کا علم ذہن کے ذریعے ہو اس کو حقیقت اور جس کا احساس قلب کے ذریعے ہو اس کو حسن کہتے ہیں۔ کسی نے حسن کو سادگی میں دیکھا تو کسی نے صناعی اور مصوری میں۔ کسی نے اسے رخِ لیلیٰ میں تلاش کیا تو کسی نے چشم مجنوں میں۔ چاند، سورج، ستارے، وادیاں، پہاڑ، کہسار، ندیاں پھول اور کلیاں اور ان کے دلفریب نظاروں سے، ان کی کشش و جاذبیت سے بھلا کون انکار کر

---

[1] اردو تنقید کا ارتقاء، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص:41، 2017

[2] فروزاں ، معین احسن جذبی، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی۔ ص:8، 1951

لیکن کوئی ضروری نہیں کہ یہ حسن و عشق شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا والا ہو یا صنف نازک سے ہی ہو۔ ایسا مقصد ہرگز نہیں کہ صنف نازک سے عشق کرنا ایک نازیبا عمل ہے۔ عورت قدرت کی ایسی شاہکار ہے جس سے کائنات میں رنگا رنگی ہے۔ یہ چراغِ خانہ بھی ہے اور شمع محفل بھی ہے، آنکھوں کا نور بھی ہے دل کا سکون بھی ہے، شباب بھی ہے سراب بھی ہے، حسین بھی ہے جمیل بھی ہے غرض کہ عورت ہی حسن و عشق کا مرکز و محور بنی ہوئی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

سکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۔

''حسن مناظرِ قدرت میں بھی ہوتا ہے اور عالم فطرت میں بھی صبح وشام کے نظارے بھی سبب کشش ہیں روشن اجالے بھی۔ اور شفق کے پھول بھی۔ طلوع ہوتا ہوا آفتاب درخشاں بھی اور غروب ہوتا ہوا شفق آلود سورج بھی، دن کی روشنیاں بھی ستاروں بھری کہکشاں بھی اور مسکراتا ہوا ستارہ سحر بھی۔ بلندیوں سے گرتا ہوا موتی برساتا ہوا آبشار بھی اور رقص کرتی ہوئی ندیاں بھی لہریں لیتی ہوئیں ریشمین جھیلیں بھی اور برف سے ڈھکی ہوئی سنگین چوٹیاں بھی۔'' [1]

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر ایک لطیف احساس فطری طور پر موجود ہے۔ وہ حسن کا شیدائی ہے۔ جہاں بھی نظر ڈالتا ہے حسن کو تلاش کر لیتا ہے اور کسی بھی خوبصورت اور حسین وجمیل شئے کو دیکھ کر محظوظ ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف حسین وجمیل اور خوبصورت چیزیں ہی فنون لطیفہ کا حصہ بن سکتی ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں۔ خوبصورت چیزوں میں حسن تلاش کرنا کوئی معرکے والی بات نہیں مزہ تو جب ہے کہ بدصورتی میں خوبصورتی تلاش کی جائے۔

جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمارے کلاسیکی شاعری میں حسن و جمال کو عاشقانہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ابتدا میں معین احسن جذبی بھی اسی تصور میں گم نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری کے بیشتر شعرا کی طرح جذبی بھی محبوب کے لب ورخسار اور اس کے پازیب کی جھنکار پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ 1929ء سے 1934ء تک کی کچھ غزلیں جذبی کی جمالیاتی حس کی غماز ہیں۔ یہ غزلیں عشقیہ جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہیں اور بالکل رومانی ہیں۔ ظاہر ہے یہ زمانہ ان کے عنفوان شباب کا تھا اس لیے ان کے ذہن کا تصور حسن وعشق سے پُر ہونا فطری تھا:

تیرے جلوؤں کی حد ملی تو کب
ہو گئی جب نظر بھی لا محدود
مل گیا ان کا نقش پا جذبی
ہو گیا جس جگہ میں سر بہ سجود

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کیفیت عشق کی معراج پر ہے اور اس کی نظریں بھی لامحدود ہوگئی ہیں تب کہیں جا کر وہ اپنے محبوب کے حسن کی جلوؤں کی تاب لا پاتا ہے۔ شاعر کے احساسِ جمال میں اتنی شدت پیدا ہوگئی ہے کہ قدم قدم پر اس کا محبوب تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اسی دور کے کلام میں کچھ ایسی غزلیں مل جاتی ہیں جن میں جنون عشق، خلشِ دل، دردِ انتظار، ضبطِ غم، سوزِ غم، خمار تشنگی، طلسم راہِ الفت، کیفیت ہجراں، احساسِ غم گساری، جلوؤں کی شوخیاں، نگاہِ لطف کے فریب کھانا، شرمیلی نگاہوں سے فرمانا، بیتابی دل، شمشیرِ قاتل، چاک گریباں، اخفائے محبت، گریہ پیہم،

[1] کلاسیکل اردو شاعری کے روایتی ادارے کردار اور علامتیں، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، شاہد پبلی کیشنز نئی دہلی، ص 336، 2006

زیست کا ساماں وغیرہ جیسے مروجہ الفاظ وتراکیب کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آہ کی دل نے نہ شکوۂ بیداد کیا
جب سے شرمیلی نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

.....

سکوں نہیں نہ سہی دردِ انتظار تو ہے
ہزار شکر کوئی دل کا غم گسار تو ہے
ثبوت درد محبت کا اور کیا ہوگا
مری نظر سے ترا حسن آشکار تو ہے

.....

تمہارے حسن کے جلوؤں کی شوخیاں توبہ
نظر تو آتے نہیں دل پہ چھائے جاتے ہیں

.....

ساقیا شیشوں میں تیرے ہے نہ پیمانوں میں ہے
وہ خمار تشنگی جو دل کے ارمانوں میں
اپنی ہستی کی حقیقت کیا میں دنیا پھونک دوں
کاش مل جائے وہ سوزِ غم جو پروانوں میں ہے

.....

آنکھوں میں تھا کسی کی احساسِ غم گساری
تیرِ نظر نے دل کی رگ رگ سے گفتگو کی

مذکورہ بالا مثالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جذبی کے یہاں تکرار کے بجائے خلوص، سپردگی اور گداختگی ملتی ہے۔ ان کے جذبات آہستہ آہستہ سلگتے ہیں یکا یک شعلہ بن کر نہیں بھڑک اٹھتے۔ وہ محبوب کی جفاؤں سے بھی پیار کرتے ہیں اور تغافل کا جواز بھی خود ہی ڈھونڈ نکالتے ہیں:

عمر بھر یوں تو زمانے کے مصائب جھیلے
تیری نظروں کا مگر بار اٹھایا نہ گیا
روٹھنے والوں سے اتنا کوئی جا کہ پوچھے
خود ہی روٹھے رہے یا ہم سے منایا نہ گیا

لیکن آہستہ آہستہ جذبی کے اسلوب اور فن میں مزید پختگی نظر آنے لگتی ہے۔ سماجی مسائل کی گونج بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ اب ان کے خیالات اور محسوسات اکہرے نہیں رہ جاتے بلکہ مختلف تجربات شاعری کے سانچے میں ڈھل کر آتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جلد ہی وہ خواب و خیال کی حسین وادیوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ اب ان کے ذاتی غم کا دائرہ وسیع ہو کر پوری کائنات پر پھیل جاتا ہے۔ جو غم ان کی ابتدائی شاعری میں تھا وہ کم و بیش بعد کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے لیکن اب اس کی نوعیت ذاتی نہ ہو کہ آفاقی ہو جاتی ہے:

آہ میں گرمیاں نہیں ، دیدۂ شوق نم نہیں
اک دلِ غم پرست کو آج کسی کا غم نہیں

سوز وہی، تپش وہی، زخم وہی، خلش وہی
پوچھیے دل سے آج کیوں نالۂ دم بہ دم نہیں

جذبی اپنے محبوب سے رنگین زمانے کو بھول جانے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

اب جذبی کے شوقِ تصور اور آہ و فغاں میں وہ تمازت نہیں رہتی۔ شاعر اپنی محبت کو ایک خواب سمجھ کر بھول جانے کی سعی کرتا ہے لیکن اس پورے عمل میں اسے کن کن کرب ناک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاعر کو محبوب کی بے وفائی کا یقین بہت مشکل سے ہوتا ہے:

میں نے جانا تھا کہ اس وقت بڑھا ہے جو ہاتھ
اب مرے ہاتھوں سے یہ ہاتھ نہ کھینچے گا کوئی
میں تو سمجھا تھا کہ تا حشر رہے گا اب ساتھ
میں تو یوں خوش تھا کہ اب ساتھ نہ چھوڑے گا کوئی

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس کو یقین ہو جاتا ہے

کہ اس کا یہ تصور ایک وہم کے سوا کچھ نہ تھا :

تند آہوں کے دبانے میں وہ سینے کا ابھار
ایک یونہی سے تلاطم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میں نے جو دیکھا تھا، جو سوچا تھا، جو سمجھا تھا
ہائے جذبی وہ تو ہم کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اس کے باوجود ان کا شوخ ذہن انھیں یہ احساس دلاتا ہے کہ اے محبت کے مارے ابھی تشنگیِ دل بجھی کہاں۔ ابھی تو محبت کے سینکڑوں جام آئیں گے۔ ابھی تو تمھیں عشق و محبت کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں۔ چنانچہ تشنگی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن اس میں وہ شدت نہیں رہتی۔ جذبات پر وجدان کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور محبوب کی پُر فریب اداؤں کا انکشاف ہو جاتا ہے:

آج یہ کیوں مجھے احساس ہے اے جانِ حیا
تیری دوشیزگیِ حسن نہیں ہے معصوم
موجِ کوثر تری باتیں ہیں مگر زہر آمیز
مشک و عنبر تیری سانسیں ہیں مگر ہیں مسموم

1932ء میں ہی جذبی کی ترقی پسند فکر نظر آنے لگی تھی۔ وہ زمانے کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے اور اس کو زندگی کا سامان تصور کرتے تھے۔ وہ اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ زندگی کے پیچ وخم اور سرد و گرم یوں ہی ان پر آشکار ہوتے رہیں تا کہ انھیں زندگی کا عرفان حاصل ہوتا رہے:

اے تلون کیش یوں مجھ پر ستم ہوتا رہے
دردِ دل ساعت بہ ساعت بیش و کم ہوتا رہے
دردِ دل ہوتا رہے احساس غم ہوتا رہے
زیست کا ساماں غرض یوں ہی بہم ہوتا رہے

فلسفہ جمال کے نقطۂ نظر سے جذبی کی نظمیں دلکش رنگ و آہنگ سے پُر نظر آتی ہیں۔ نظم ''گل'' میں تخیل آفرینی، فطرت سے لگاؤ اور حسن پرستی کو بہت ہی دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ نظم کو پڑھتے وقت فطرت کے مناظر ہمارے اندر ایک لطیف احساس پیدا کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے گلِ رنگیں قبا اے غازۂ روئے بہار
تو ہے خود اپنے جمالِ حسن کا آئینہ دار
ہائے وہ تیرے تبسم کی ادا وقتِ سحر
صبح کے تارے نے اپنی جان تک کر دی نثار
خامشی تیری ادا ہے، سادگی فطرت میں ہے
پھر بھی جو تیرا حریفِ حسن ہے حیرت میں ہے

نظم ''فطرت ایک مفلس کی نظر میں'' جذبی کی ترقی پسندی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ انھوں نے اس نظم میں فطرت کے حسن کو آلام روزگار کے پس منظر پر بہت ہی دل دوز انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ احساس پر بہت زور دیتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو بغیر کسی بناوٹ کے جوں کا توں پیش کر دیتے ہیں:

اس چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے مجھ کو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
مجھ کو تو جنوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں
کوئل کے رسیلے گیت سنے لیکن یہ کبھی سوچا تو نے
ہیں الجھے ہوئے نغمے کتنے اک ساز کے ٹوٹے تاروں میں

جذبی اپنے محبوب کے چاند جیسے مکھڑے پر روٹی کے ٹکڑے کو ترجیح دیتے ہیں:

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسین، کیسی زہرہ، کسی پروین
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں

ان کی نظروں میں دنیا کا ہر منظر اسی وقت حسین و جمیل معلوم ہوتا ہے جب پیٹ بھرا ہو اور جیب میں پیسے ہوں:

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

یہ شعر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حسن کا حقیقت سے ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ جذبی کی نظر میں ایسے حقائق و تجربات اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتے جب تک کہ وہ احساس سے ہم آہنگ نہ ہو جائیں۔ جذبی اپنے جمالیاتی حس، حسن تخیل اور لفظیات کی مدد سے حسن و عشق کی ایک خوبصورت اور دلکش تصویر بناتے ہیں۔ نظم راز و نیاز اس کی اچھی مثال ہے:

تیرے گیسوؤں کو پریشان کر کے
تجھے رشکِ سنبل بنایا ہے میں نے
اگر میں بنا ہوں محبت کا دریا
تجھے ماہِ تاباں بنایا ہے میں نے
جھلکنے لگے تیری آنکھوں میں موتی
یہاں تک تجھے گدگدایا ہے میں نے
ترے شوخ ہونٹوں کی موجوں سے اکثر
محبت کا طوفاں اٹھایا ہے میں نے
ستا کر، جلا کر، رُلا کر، ہنسا کر
تجھے مدتوں آزمایا ہے میں نے

''بے زار نگاہیں'' اور ''تو ہم'' میں جذبی اپنے محبوب سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں جو خوبیاں محبوب میں پہلے نظر آتی تھیں وہ محض وہم و گمان کے سوا کچھ نہ تھیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی جذبی کی کئی ایسی نظمیں ہیں جو ان کے جمالیاتی شعور اور تصور حسن و عشق کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا جذبی کے اس شعر کے ساتھ اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں کہ:

ہزار حسن کی فطرت سے ہو کوئی آگاہ
نگاہِ لطف کے سب ہی فریب کھاتے ہیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین
کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب
سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:
زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

توصیف مجید لون

مضمون

حقیقت ورومان کا بادشاہ۔۔۔نور شاہ

ریاست جموں وکشمیر ابتدائے اول سے ہی علوم و فنون،تہذیب و تمدن ،فکر و فلسفہ کا گہوارہ رہی ہے ۔علم ،ادب ،فن،موسیقی ،کاریگری،فلسفہ کون سا شعبہ ہے جہاں کشمیریوں نے اپنے کارناموں کا جوہر نہ دکھایا ہو۔اردو زبان وادب کے سرمایے حسن میں بھی جو تخلیقی کارنامے یہاں کے ذہن رسا لوگوں نے انجام دئے ہیں وہ محتاج تعارف نہیں ۔دنیائے ادب میں یہاں کے قلمکاروں نے اپنی ذہنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔اردو کی ترقی و ترویج میں جہاں دوسری ریاستیں اردو کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہے وہیں کشمیری اپنے خونِ جگر سے گیسوئے ادب کو سنوارنے میں اپنے شانہ فکر و خیال کے ساتھ مصروف عمل رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اقبالؔ، چکبستؔ ،سرشارؔ،نسیمؔ،آغا حشرؔ،سادت حسن منٹو،قدرت اللہ شہاب،رام آنند ساگر کرشن چندر،اور بے شمار دوسری سدا بہار ادبی شخصیتیں ہیں جو اس کارواں کے روح رواں تھے جنہوں نے اپنے تخلیقی ذہن کی تمام توانائیوں کے ساتھ اردو ذبان وادب کی توسیع میں اہم رول ادا کیا۔

۱۹۵۰ سے لیکر تا ئیدم کے جن کشمیری ادیبوں نے تن من دھن کے ساتھ منٹو اور کرشن چندر کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کی ہے ان میں نور شاہ کی اہمیت خاصی اہم ہے ۔کشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ میں جہاں پریم ناتھ پردیسی کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے وہیں نور شاہ کی ذات مستند اور قد آور ہے ۔وادی کشمیر کے اس معتبر اور مستند قلمکار نے ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو جنت بے نظیر کے تاریخی شہر سرینگر میں آنکھ کھولی۔موصوف نے اپنی تعلیم کا آغاز سرینگر میں ہی کیا۔سرینگر میں بعض حضرات کی سرپرستی میں چھوٹی موٹی ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھی ان میں نئی نسل کے ادیب اور شاعر شریک ہوتے رہے ان ادبی محفلوں کا اثر موصوف کی شخصیت پر بھی پڑا۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد کے۔اے۔ایس کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس میں آگئے اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔کے۔اے۔ایس کی نوکری کچھ حد تک ان کے تخلیقی دنیا میں مانع رہی ہوگی لیکن اس دوران جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھے اس کا اظہار اپنی تخلیقات میں اب وہ ریٹائر ہو کے کر رہے ہیں۔پچھلے کئی دہائیوں سے ان کا قلم کچھ اسطرح چل پڑا ہے کہ انہوں نے افسانہ،ناول تحقیق وتنقید،ڈرامہ،خاکہ،کالم نویسی وغیرہ میں اپنے قلم سے جواہر ریزے بکھیر دئے ہیں ۔انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ شعر وادب کی خدمت کے لئے صرف کیا نتیجتاً شعر وادب میں تخلیقات کا انبار لگا بیٹھے اور تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں مختلف اصناف ادب پر منظر عام کر کے اپنی شناخت و پہچان بنانے میں دیر نہ لگائی۔

نور شاہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ''گلاب کا پھول'' نام کی کہانی سے کیا جو ماہنامہ بیسویں صدی دہلی سے شائع ہوا بقول نور شاہ۔

''آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرا یہ افسانہ'' گلاب کا پھول'' ترتیب میں تیسرے نمبر پر تھا۔میرے نام سے پہلے کوثر چاندپوری 'چھوٹا نگ'اور شکیل الرحمان 'سہارا' کے افسانے ترتیب میں پہلے اور دوسرے نمبر پر تھے''

اس رسالے میں چھاپ اس بات کی ضمانت تھی کہ قلمکار واقعی کل ایک نامور تخلیق کار ہوگا۔انجام کار اس کے بعد ان کے عزم و ہمت میں پختگی اور تبدیلی آگئی اور تسلسل کے ساتھ اردو شعر وادب خصوصاً کہانی کے کینواس پر رنگ بھرتے رہے۔کہانی

گلاب کا پھول شائع ہونے سے ان کے مزاج نے ایسے کروٹ بدل لی کہ ہاتھ سے قلم جدا نہیں ہوا۔ بعد میں انہوں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا اور شہرت کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے لئے اپنا مقام طے کیا۔ انہوں نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ریاست کے کئی معتبر افسانہ نگاروں نے عالم ادب کے افسانوی منظر نامے پر اپنے نام کا پرچم گاڑھ لیا تھا جن میں برج پریمی، حامدی کاشمیری ،ٹھاکر پونچھی ،وریندر پٹواری، پشکر ناتھ، علی محمد لون، اختر محیدین، غلام رسول سنتوش، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی کہنہ مشق ادیبوں کی تربیت میں نورشاہ نے محنت و ریاضت مشاہدہ اور مطالعے کے بل بوتے پر اپنے مخصوص انداز ے اور رویے کی وجہ سے اپنی ادبی اہمیت وقت کے اکابریں و ناقدین سے تسلیم کرائی ۔اپنے زریں شعاؤں سے نورشاہ افسانوی ادب میں ایک تابندہ و درخشندہ ستارے کی مانند چمکتے رہے۔ بقول چاندنی بیگم ''کہانیوں اور افسانوں کی دنیا میں لوگ اپنا مقام بناتے ہیں مگر نورشاہ نے

اپنے طرز بیاں اور انداز تحریر سے ایک نئی دنیا بسائی ہے اور یہ دنیا بے شک جنت سے کچھ کم نہیں''

انہوں نے آج تک جو کتابیں اردو ادب کی تجوری میں ڈال دی ہیں ان کی فہرست بذیل ہے۔

۱۔ بے گھاٹ کی ناو
۲۔ ویرانے کے پھول
۳۔ ایک رات کی ملکہ
۴۔ من کا آنگن اداس اداس
۵۔ گیلے پتھروں کی مہک
۶۔ بے ثمر سچ
۷۔ آسمان پھول اور لہو
۸۔ کشمیر کہانی
۹۔ کیسا ہے یہ جنوں
۱۰۔ نیلی جھیل کالے سایے
۱۱۔ پائل کے زخم
۱۲۔ آؤ سو جائیں
۱۳۔ آدھی رات کا سورج
۱۴۔ لمحے اور زنجیریں
۱۵۔ انتخاب اردو ادب جموں وکشمیر ۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک
۱۶۔ کہاں گئے یہ لوگ
۱۷۔ بند کمرے کی کھڑکی

علاوہ ازیں ان کی بیشتر کہانیاں، مضامین مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی ادب فطرتاً اپنے ماحول سے بے گانہ نہیں ہوسکتا۔ ہر ادیب، ہر مصنف اور ہر شاعر بلواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ اور غیر دانستہ اپنے گردوپیش کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ سماج کے جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس طبقے کی حمایت کرتا ہے۔ کوئی بھی قلمکار اپنے گردونواح کے حالات واقعات، حادثات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ جب بھی کوئی قلمکار کہانی، ناول، افسانہ یا کوئی دوسری تحریر تحریر کرتا ہے تو وہ کوئی نئی دنیا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بناتا بلکہ وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے اور وہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا ہماری زندگی، تہذیب و تمدن اور حالات سے تعلق ہوتا ہے۔ نورشاہ کے تخلیقات میں یہ باتیں بہ آسانی پائی جاتی ہیں۔'' بے گھاٹ کی ناؤ'' میں شامل ۱۵ افسانے جن میں گلاب کا پھول، زعفران کی لالی، گل خان ،گلاب، بے گھاٹ کی ناو، قابل ذکر ہیں کے غور وفکر اور مطالعے کے بعد یہ حقیقت وا ہو جاتی ہے کہ نورشاہ شعوری طور ہی نہیں بلکہ لاشعوری طور پر بھی اپنے وطن کی مٹی کے گیتوں میں مگن نظر آتے ہیں نورشاہ اس سلسلے میں یوں فرماتے ہیں ۔

''دراصل وادی کے جس حصے میں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا

ہے اور جوانی کے ایام جیے ہیں وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی، اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے۔ کہنا یہ ہے وادی کے اس حصے میں میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں کا منعکس ہے''

ان افسانوں میں جو کردار واقعات انہوں نے پیش کئے ہیں وہ کہیں تو ان کی ذات کا حصہ ہے اور کہیں ان کے حقیقی ماحول کا جز۔ افسانوں کے پلاٹ و کردار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نورشاہ اپنی سرزمیں کے ساتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ نورشاہ نے اپنی زندگی کے شب و روز کشمیر میں گذارے ہیں کشمیر کے لازوال حسن اور فطری مناظر نے انہیں بے حد متاثر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کہانیوں میں وادی گلپوش کی گہری چھاپ ہے بقول دیپک بدکی۔

''کشمیر افسانہ نگاروں کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے نورشاہ کے افسانوں میں بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملتا ہے''

حسین پس منظر کا پرکشش بیاں نورشاہ نے جنت ارضی کے ماحول سے سیکھا ہے وادی کشمیر کے خوبصورت نظاروں، آبشاروں نے نہ صرف ان کو افسانوی مواد عطا کیا بلکہ اس شخصیت اور فکر کو بھی نکھارا۔ اس سرزمیں نے انہیں boost کیا نورشاہ نے کشمیر پر متعدد کہانیاں تحریر کی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل، جو آگے پھیل کر سکھ مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا رواج رہتا ہے یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مگیں ہیں''

کشمیر کے کے حالات و واقعات کی بھی انہوں خوب ترجمانی کی ہے ان کی کہانیاں یہاں کے مفلوک الحال انسان، مظلوم، مجبور اور محکوم عوام کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ حساس فنکار نے حقیقت نگاری اور صداقت شعاری سے مظلوم کشمیریوں کی زبوں حالی کی عکاسی کی ہے۔ ''کہانی ایک علیا کی'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک مرقبان کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے علیا کے آمدن کا ذریعہ ایک گھوڑی ہوتی ہے لیکن اس کی موت کے بعد علیا اور اس کے افرادخانہ کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی یہاں تک کہ جب علیا کی بیوی بیمار ہو جاتی ہے تو اس کے علاج معالجے کے لئے بھی پیسے نہیں جڑ جاتے۔ افسانے کہانی ایک علیا کی کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ نورشاہ کے لئے سماجی نا انصافی تکلیف دہ اور اسکی روح کراہتی ہوئی چیخنے پر مجبور ہو جاتی ہے کوئی بھی زیادتی وہ برداشت نہیں کر پاتے مساوات اور انصاف کی وکالت انہوں نے ہمیشہ اپنے افسانوں میں کی ہے اسطرح بے انصافی اور استحصال کے خلاف نفرت اور غم و غصے کے اظہار میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

نورشاہ نے جہاں ایک عظیم فنکار کی طرح حقیقت نگاری کو اپنا وسیلہ اظہار بنالیا ہے وہی نورشاہ نے رومانیاں کہانیاں لکھ کر ناقدین و محققین سے اپنی انفرادیت و شناخت تسلیم کرآئی ہے بقول پروفیسر قدوس جاوید ''نورشاہ شہنشاہ رومان ہیں'' نورشاہ افسانوی مجموعے ''بے ثمر سچ'' میں لکھتے ہیں

''میرے افسانوں کے کردار رومانی ہیں میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے سے رومان کے چشمے ہی پھوٹتے ہیں زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے'' نورشاہ نے بیشتر کہانیاں حسن و عشق پرستی کے حوالے سے تحریر کی ہیں افسانہ ''بے بدن'' سے اقتباس ملاحظہ ہو۔ ''ایک بار پھر کھلی کھلی نظروں سے پھٹی ہوئی جالی کے اندر جھانکنے لگتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے اس کے صحت مند جسم کی ساری گرمی میرے تشنہ اور دہکتے ہوئے بدن میں اتر گئی اس کی بھری بھری لداخی خوبانیاں ایسے رس دار ہونٹ میرے خشک ہونٹوں کی تشنگی کو

سیراب کررہے ہوں''

نورشاہ ایک رومانی افسانہ نگار ہے ان کے یہاں محض تصوراتی یا تخیلا نہ رومان نہیں بلکہ ان کے افسانوں میں حقیقی رومان ملتا ہے۔''افسانہ میری آرزو میری تمنا'' سے اقتباس بطور نمونہ۔

''یہ تنہا گوشہ ہمارے ملاپ کا منہ ہے آو یہاں پھول چڑھائیں اور پھر آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ بھی تو ہے ۔۔۔۔راجندر نے شانتا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چوما''

کشمیر کی وادی کے بے مثال حسن اور انسانی محبت کے پرخلوص جذبے نے نورشاہ کو حقیقت اور رومان کا افسانہ نگار بنادیا یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں رومانی، سماجی، اور انسانی قدروں سے متعلق کی کہانیاں پائی جاتی ہے بقول مجید مضمر۔

رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نورشاہ کا تخلیقی برتاو خاصی اہمیت رکھتا ہے''

نورشاہ کے قلم نے کہیں پھول کھلائے تو کہیں شعلہ فشانی کی اور کہیں آئینہ خانے سجائے۔ بہرنوع ان کے افسانوں کی فضا حقیقت پسندی اور رومانیت کے امتزاج سے تیار ہوتی ہے۔اور نورشاہ اس فضا کو زبان و بیاں کی خوشبو سے معطر کرتا ہے ۔خوبصورت زبان اور شگفتہ انداز سے کشت زعفران زار تیار کرنے کا ہنر انہیں بخوبی آتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل

مطالعہ

''لسانی مسائل ومباحث'':ایک تجزیاتی مطالعہ

'لسانی مسائل ومباحث' پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کی تازہ ترین تصنیف ہے۔مرزا خلیل احمد بیگ کے بارے میں یہاں پر بہت کچھ نہ کہہ کر مشہور دانشور اور کریٹک شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ اقتباس درج کر دینا کافی ہے جس سے آپ بحسن وخوبی پروفیسر بیگ کی ادبی قد وقامت کا اندازہ لگا سکتے ہیں:

''گیان چند کے بارے میں تمھارے مفصل مضمون کی نقل ملی ۔بہت خوشی ہوئی اور میں تمہارا شکر گذار ہوں کہ تم نے نہایت پرزور،متین اور مفصل مضمون لکھا۔شاید تمھیں یاد ہو کہ ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ اردو کے ماہر لسانیات نے کبھی یہ بات کھل کر نہیں کہی کہ اردو کو ہندی پر تقدم زمانی ہے اور ہندی کی 'شیلی' اردو نہیں بلکہ اردو کی 'شیلی' ہندی ہے اور کھڑی بولی اور اردو ایک ہی ہیں،مجھے خوشی ہے کہ تم وہ پہلے ماہر ہو جس نے یہ باتیں اردو میں کہیں''۔(ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی:مرزا خلیل احمد۔ایجوکیشنل بک ہاؤس۔سن اشاعت 2007۔ص3)

یہ پوری کتاب 15 مباحث پر مشتمل ہے۔پہلا مبحث 'اردو کا نقطۂ آغاز (آغاز اردو کے ایک نئے نظریے کی تشکیل) سے موسوم ہے۔اس مبحث کے شروع میں مصنف نے بہ تدریج مختلف قدیم ہندوستانی زبانوں جیسے سنسکرت، پراکرت واپ بھرنش کی ابتدا،ارتقاء اور زوال کا جائزہ لیا ہے،واضح رہے کہ انہی اپ بھرنشوں سے جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آئیں ہیں،جن میں سے ایک اردو بھی ہے اور یہ زمانہ 1000 سنہ عیسوی کے لگ بھگ کا ہے۔ یہ وقت اس لئے بھی اہم ہے کہ اسی عرصہ میں شمالی ہندوستان میں بہت ساری سیاسی،تہذیبی اور لسانی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

مسعود حسین خان اردو کا آغاز مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد سے مانتے ہیں جب دہلی کی آس پاس کی بولیوں میں عربی وفارسی کے لسانی اثرات حلول کر جاتے ہیں۔اس طرح سے وہ اردو کو مسلمانوں کی زائیدہ و پروردہ زبان مانتے ہیں۔جبکہ مرزا خلیل احمد بیگ مسعود حسین کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے،ان کا خیال ہے کہ زبان کی پیدائش کا معاملہ کوئی بجلی کا بٹن آن کر دینے جیسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے آناً فاناً میں اردو وجود میں آ گئی ہو۔وہ اس بات کے بھی انکاری ہیں کہ اردو زبان مسلمانوں کی زائیدہ ،پروردہ ہے البتہ وہ اس بات کے موئدین میں سے ضرور ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے اس زبان نے رفتار پکڑی ۔

ان سب کے باوجود مصنف اپنے آغاز اردو کے اس نظریے کو مسعود حسین خان کے نظریہ آغاز زبان اردو کی تردید نہیں بلکہ اس کو وہ اس کی توسیع کہتے ہیں۔مگر کتاب کے اس مبحث کو شروع تا آخر پڑھ کر ایسا کچھ بھی مترشح نہیں ہوتا ہے جس کی ایک بڑی وجہ مرزا بیگ کی اس مبحث کی شروع کی وہ عبارت بھی ہے جس میں کہ وہ اپنی ان باتوں کو آغاز اردو کے ایک نئے نظریے کے طور پر دیکھے جانے کی وکالت کرتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا مبحث ''اردو زبان کا تاریخی تناظر'' ہے۔اس مبحث میں مصنف نے بہ زور دلائل ثابت کیا ہے کہ ہندی کے مقابلے میں اردو ایک قدیم زبان ہے جو پہلے ہندی،ہندوی ،گجری،دکنی،پھر ریختہ اور سب سے آخر میں اردو کے نام سے جانے

جانے لگی۔انہوں نے ہندی کے ان نام نہاد بدھی جیویوں کی بھی کھل کر مخالفت کی جو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ اردو کا اردو نام اٹھارویں صدی کے اواخر میں پڑا۔اس سے پہلے اردو نام کی کوئی زبان ہی نہ تھی ۔ان کے مطابق شروع سے جو زبان چلی آ رہی تھی وہ اصل میں ہندی ہی تھی اور اسی میں سے ہی ہندی الاصل الفاظ کو خارج کر دینے اور اس کی جگہ پر عربی و فارسی کے الفاظ کی ٹھونس ٹھانس سے جو ایک الگ زبان تراشی گئی وہ ہی اردو کہلائی۔مرزا خلیل احمد بیگ نے ان بدھ جیویوں کے اس خیال کی تردید ہی نہ کی بلکہ اس کو انہوں نے سراسر لغو اور لسانی تعصب پر مبنی خیال قرار دیا ۔

اس مبحث کے آخر میں انہوں نے اس حقیقت پر زور دیا کہ اصل میں اردو زبان کھڑی بولی کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جو بارھویں صدی کے اواخر سے شمالی ہندوستان میں بلا لحاظ مذہب وملت بولی جاتی تھی نیز ادبی لحاظ سے بھی یہ زبان نہایت ہی ترقی یافتہ اور ثروت مند زبان تھی۔

مرزا خلیل احمد بیگ کا خیال ہے کہ زمانہ حال کی ہندی یا ناگری اٹھارویں صدی عیسوی کے خاتمے کے بعد غیر فطری طور پر وجود میں آئی ہے،انیسویں صدی کی شروعات میں فورٹ ولیم کالج میں اسی زبان یعنی کھڑی بولی میں سے ہی عربی و فارسی کے الفاظ کو خارج کر کے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ رکھ کر موجودہ ہندی بنائی گئی اور اس کے لئے دیوناگری رسم الخط اختیار کیا گیا۔

بالائے ستم یہ کہ شمالی ہند کے ہندو بھی جواب تک بلا کسی مذہبی تفریق کے اردو پڑھتے لکھتے تھے انہوں نے بھی دھیرے دھیرے اس نئی اور مصنوعی زبان کو اپنا لیا۔پھر اس کے بعد انیسویں صدی کی ہندو احیا پرست تنظیموں نے ہندی آندولن کی تحریک چھیڑ کر اور بھی زیادہ اردو کو نقصان پہنچایا۔اور آج عالم یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں کہیں بھی آپ کو کوئی ایک بھی ہندو اردو پڑھتا،لکھتا ہوا نظر آ جائے تب بھی غنیمت ہے۔

اس مبحث کے آخر میں مصنف نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ معاصر ہندی جو کہ اردو کے بطن سے نکلی ہے۔ حقیقی معنی میں اس ہندی کو اردو کی شیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا نہ کہ اردو کو ہندی کی شیلی سمجھنا جیسا کہ ہندی کے 'بدھ جیویوں' کی غیر منطقی سوچ ہے۔

تیسرا مبحث ''اردو کی کھڑی بولی بنیاد'' ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے حتمی انداز میں یہ بات کہی ہے کہ اردو کی اصل بنیاد کھڑی بولی ہے۔ان سے پہلے کے ماہرین لسانیات میں چاہے محمود خان شیرانی ہوں یا شوکت سبزواری ،زور ہوں یا مسعود حسین خان ،ہر ایک نے اس پہلو سے گریز کیا ہے۔

جیسا کہ کسی حد تک اوپر ذکر آ چکا ہے کہ 1000 سنہ عیسوی کے قریب جب اپ بھرنشیں زوال پذیر ہونا شروع ہوئیں تو ان کے بطن سے کئی آریائی زبانیں پیدا ہوئیں انہی میں سے ایک کھڑی بولی بھی تھی جو دہلی اور اس کے نواح میں بولی جانے لگی اور اس نے جلد ہی عوام الناس میں اپنی پکڑ مضبوط بنالی۔پھر جب 1193 کے دورانی عرصے میں مسلمانوں نے دہلی کو فتح کیا اور ان کی سلطنت قائم ہوئی تو ان کے اس عمل سے اس کھڑی بولی کو اور بھی زیادہ تقویت پہنچی ،کیوں کہ جو مسلمان ترکستان،ایران وافغانستان وغیرہ سے یہاں ہجرت کر کے آئے تھے انہوں نے جہاں اس زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا،وہیں اس میں انہوں نے ضرورت کے مطابق عربی،فارسی اور ترکی کے الفاظ بھی داخل کرنے شروع کئے،اس کے باوجود اس میں سنسکرت کے الفاظ کی ایک معتد بہ تعداد رہی۔مسلمانوں کے اس عمل سے جہاں اس زبان میں نئی نئی آوازیں پیدا ہوئیں وہیں اس کی ہیئت بھی تبدیل ہوگئی۔اس سے

اس زبان کی ایک نئی شکل ابھر کر سامنے آئی لیکن اس کے باوجود بھی اس کی بنیادی ساخت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

اس زبان کا نام نو واردان نے ہندی رکھ دیا۔ واضح رہے کہ یہاں پر ہندی سے مراد کوئی مخصوص زبان نہ تھی بلکہ یہاں پر 'ی' یائے نسبتی ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ وہ زبان ہے جو ہند یا ہندوستان میں بولی جاتی ہے یا اس سے تعلق رکھتی ہے۔ بعد میں یہی زبان ہندوی ،دکھنی، دکنی، گجری وغیرہ کے نام سے موسوم ہوئی، بہت بعد میں اس زبان کو ریختہ اور سب سے آخر میں یہی زبان اردو کہلائی، اس نام سے اس کی آج بھی شناخت قائم ہے۔

چوتھا مبحث ہے'' کھڑی بولی اور اہل ہندی (ایک تاریخی جائزہ)۔ اس مبحث میں مصنف نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ 1810 میں جب نو واردان انگریز کو اردو زبان جسے عرف عام میں ہندوستانی بھی کہا جاتا تھا، سکھانے کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تو اس کا سروے سرواگل کرسٹ کو بنایا گیا۔ اس کالج سے بالواسطہ طور پر اردو زبان و ادب کو جو فائدہ پہنچا اس سے کسی بھی اردو کے بہی خواہ کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی ہے۔ مگر گل کرسٹ کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ 'خناس' بھی گردش کرتا رہا کہ ہندوستانی (اردو) اگرچہ ہندوستانیوں کی عام زبان ہے ،مگر اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے جو مسلم مذہب، تہذیب اور کلچر کی طرف زیادہ فوکس کرتے ہیں، لہٰذا کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ اس سے ہٹ کر کچھ ایسی کتابیں تصنیف کرائی جائیں جن میں کہ سنسکرت الفاظ کی کثرت ہو اور جس سے کہ ہندوؤں کے مفاد کا تحفظ بھی ہو، پھر اس نے اس مقصد کے لئے کالج سے ایک اسامی کے نکالے جانے کی درخواست کی پھر آناً فاناً میں اس جگہ پر للو لال جی کا تقرر بھی عمل میں آ گیا۔ جن کا تعلق آگرے سے تھا۔ ظاہر ہے گلکرسٹ کا یہ فیصلہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا غماض تھا۔ اس کے اس فیصلے سے کھڑی بولی جس کی زائیدہ و پروردہ زبان اب تک اردو ہی سمجھی جاتی تھی اب یہ دو خانوں میں منقسم ہوگئی۔

للو لال جی نے گلکرسٹ کے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے 'پریم ساگر' لکھنی شروع کی ظاہر ہے اس وقت تک ان کے سامنے اس کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے عربی و فارسی کے لفظوں سے یکسر احتراز کیا اور ان کی جگہ سنسکرت کے لفظوں کا استعمال کیا اور پھر اس کے لئے انہوں نے جو رسم الخط استعمال کیا وہ دیوناگری تھا، جو پہلے سے ہی سنسکرت کی صورت میں موجود تھا۔ للو لال جی اس مقصد میں اس لئے بحسن خوبی کامیاب ہوئے کیوں کہ ان کا تعلق پہلے سے ہی ہندوستانی (اردو) شعبے سے تھا وہ عربی ،فارسی اور سنسکرت الفاظ کی اصل سے بخوبی واقف تھے۔

یہاں پر مصنف نے ہندوستانی کے ساتھ ساتھ ان مغربی ماہرین لسانیات کی بھی نشاندہی کی ہے جنہوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کا بہ بانگ دہل اعتراف کیا ہے کہ اردو ہندی سے قدیم تر زبان ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ گریرسن کا ذکر کیا ہے۔

مصنف نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر تک کھڑی بولی میں ہندی شاعری کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ ہندی شعراء کے پاس پیچھے مڑ کر اردو شعراء اور ان کی شاعری کی طرف دیکھنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ کیوں کہ اردو شاعری صدیوں کی تراش خراش کے بعد اپنی ترقی یافتہ شکل میں پوری آب و تاب کے ساتھ پہلے ہی سے جلوہ گر تھی۔ اس امر کا گاندھی جی نے بھی بڑے کھلے دل سے اپنے خطوط میں اعتراف کیا ہے:

''اردو ہندی سے زیادہ صاف ستھری ہے اس کی ایک

مثال لکھتا ہوں ۔ ہندی کے ایک مشہور لیکھک کا یہ جملہ ہے ''سمجھ میں نہیں آنے سے گھبراہٹ سی لگنے لگتی ہے'' اردو میں گھبراہٹ لگتی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ پیدا ہوتی ہے۔اردو کا کوئی محاورہ مشہور لیکھک کبھی غلط نہیں لکھے گا ،اور اگر لکھ دے گا تو اس کو مورچہ لینا پڑے گا ۔ہندی میں بھاشا کو سدھارنے کی کوئی تحریک ہی نہیں ہے۔دراصل کوئی تحریک شروع کرنے کے بجائے اردو زبان کی کتابیں یا مضمون ہندی حرفوں میں چھپنے لگیں، ہندی زبان کا بہت بھلا ہوگا ،اور اردو زبان کے سدھارنے اور سنوارنے میں اردو کے شاعروں اور لیکھکوں نے پچھلے کئی برسوں سے جو ہاتھا پائی کی ہے اس کا فائدہ ہندی بھاشا کو آسانی سے مل جائے گا اور اس استعمال سے وہ آپ سے آپ ہندوستانی بن جائے گی''۔(گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ۔(مترجمہ) عشرت علی صدیقی۔ اتر پردیش ،اردو اکاڈمی لکھنو ۔سال اشاعت 1980۔ص196)

مصنف نے یہاں پر خاص طور سے دھریندرورما کو کوڈ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کھڑی بولی ہندی کا رواج نثری ادب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں اور نظم میں بیسویں صدی میں ہوا۔

اس کتاب کا پانچواں مبحث ''مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کے قدیم ترین حوالے'' ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے شمالی ہند میں زبان ہندوی کا پہلا اور بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس سلسلے میں سب سے پہلے جس شاعر کا ذکر ملتا ہے وہ ہیں گیارہویں صدی عیسوی کے مسعود سعد سلمان ۔وہ عربی و فارسی کے مستند شاعر تھے اور ان دونوں زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔

سدید الدین محمد عوفی (1242-1171) نے اپنے تذکرے لب الالباب میں ذکر کیا ہے کہ مسعود سعد سلمان کا ایک ہندی زبان میں بھی دیوان ہے۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ہندی سے کون سی ہندی زبان مراد ہے؟ اس ذیل میں مسعود حسین خان کا خیال ہے کہ یہ پنجابی کی طرح کی کوئی زبان رہی ہوگی۔لیکن مرزا خلیل احمد بیگ نے مسعود حسین خان کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ عوفی جب ہندوی زبان کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کھڑی بولی کی طرح کی ہی کوئی زبان رہی ہوگی۔اگر پنجابی زبان میں یہ دیوان ہوتا تو وہ اس کی بھی صراحت کر دیتا کیوں کہ عوفی پنجابی زبان سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس کتاب کا چھٹا مبحث ہے' 'اردو زبان کی سماجی اور تہذیبی جڑیں''۔کوئی بھی زندہ زبان دو سطحوں سے پہچانی جاتی ہے ایک تو ہوتی ہے اس کی لسانی سطح اور دوسری ہوتی ہے ادبی سطح۔

لسانی سطح کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان جس خطے یا علاقے میں بولی جاتی ہے اس کی جڑیں اس علاقے میں کس حد تک پیوست ہیں۔ جہاں تک رہا اردو کا سوال تو ہر کوئی اس حقیقت سے واقف ہے اس کا خمیر ہی یہاں کی مٹی سے تیار ہوا ہے،اس کی سماجی وتہذیبی جڑیں یہاں کی ہی سرزمین سے وابستہ ہیں لہذا اردو یہاں کی فکرو فضا سے ہم آہنگ نہ ہو،ممکن ہی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور سطح ہوتی ہے جو ادبی کہلاتی ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے اس زبان کی جڑیں ہندوستانی سماج میں گہرے طور سے پیوست ہیں،اس لئے اس کے ادب میں آپ کو یہاں کی تہذیب و معاشرت کی دھڑکنیں سنائی دیں گی، اس طرح سے آپ دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اردو زبان و ادب ہندوستان کی ہر دھڑکن اور سوچ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مصنف نے اس حقیقت کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔اس ذیل میں خاص طور سے انہوں نے گوپی چند نارنگ کے مضمون ''بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں'' کا ذکر کیا ہے۔ بیدی کی بیشتر تخلیقات میں ہندوستانی اساطیر کا گہرا رنگ ہے۔اس کے علاوہ

مصنف نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کا بھی ذکر کیا ہے، جو اپنے اندر ہندوستانی تہذیب اور فلسفے کو سموئے ہوئے ہے۔ آخر میں انہوں نے میر انیسؔ کا بھی ذکر کیا ہے جن کے مرثیوں کے اکثر کردار عربی ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں۔

اس ذیل میں اردو کے مشہور ناقد اور دانشور محمد حسن عسکری رقمطراز ہیں:

''ہمیں اس (اردو زبان) کی ہندوستانیت پر فخر ہے اور ہم اس ہندوسانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔ اس زبان کے لب و لہجہ میں، اس کے الفاظ وجملوں کی ساخت میں ہماری بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور ہم نے مانجھ مانجھ کر اس زبان کی ہندوسانیت کو چمکایا ہے (بحوالہ: کلیدی خطبہ پروفیسر حنفی۔ مشمولہ، اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ، مرتبہ خواجہ اکرام الدین، قومی اردو کونسل، سال اشاعت 2014، ص 12)

مصنف نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے کہ اردو بولنے والے چاہے کسی علاقے یا خطے سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں وہ ایک مشترکہ تہذیبی و ثقافتی رشتے میں رچے، بسے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شعر و ادب میں علاقائی تہذیب و ثقافت کی عکاسی مفقود ہے؟ انہوں نے اس بات کی بھی کھل کر وضاحت کی کہ بہار، بنگال، پنجاب نیز دہلی، لکھنو حیدرآباد کے بے شمار ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے اپنے خطوں کی ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔

اس مبحث کے آخر میں مصنف نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ اردو زبان اپنے اندر بعض عربی اور ایرانی اثرات کو بھی جذب کئے ہوئی ہے مگر اس سے اس کے ہند آرائی یا ہندوستانی کردار کی نفی نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس سے اردو زبان و ادب کے حسن میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

مصنف نے اس مبحث کے آخر میں ہندوستان میں اردو کی مقبولیت کے گراف پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا کہ اردو اپنی مخالفت کے باوجود ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے، اور 2001 کی مردم شماری کے مطابق یہاں پر اردو بولنے والوں کی کل تعداد 51536111 ہے جو یہاں کی کل آبادی کا 5.01 فیصد ہے۔

ساتواں مبحث ''اردو قواعد نویسی کی روایت'' ہے۔ زبان کی افہام و تفہیم اور ترقی میں اس کی قواعد کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو کسی ملک کی تعمیر و ترقی اور اس کی خوشحالی میں اس ملک کے قوانین، رول و ریگولیشن کو ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر بھی زبان، زبان رہے گی مگر اس میں وہ پختگی نہ ہوگی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔ اب جہاں تک رہا اردو زبان کا سوال تو اس کی بہت ساری قواعدیں لکھی گئی ہیں۔ اردو زبان کو یہ فخر و افتخار بھی حاصل ہے کہ اس زبان میں قواعد نویسی کی ابتداء اہل یورپ کے ہاتھوں ہوئی۔ اور یہ سلسلہ کم و بیش بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔ اس سے اردو کے لسانی و قواعد سے متعلق ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ اس ذیل میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے خاص طور سے جون شوا کیٹیلر، ڈیوڈ ملز، بنجمن شلر، کیپٹن جارج ہیڈلے، جان بورتھورک گل کرسٹ، جان شیکسپیئر، کیپٹن ولیم پرائس، گارسان دتاسی، ولیم ییٹس، جیمز رابرٹ بیلن ٹائن، ڈکن فاربس، مونئر ولیمز، جان ڈاؤسن، جان ٹی پلیٹس، ایڈورڈ ہنری پامر، کیملو تگلیا بو، اے سیڈل، جان اسما وغیرہ کی قواعد کی کتابوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مادری زبان اردو نہ

تھی۔

انشاءاللہ خان انشاء وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے قواعد نویسی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی مگر انہوں نے جو قواعد لکھی وہ اردو کے بجائے فارسی زبان میں تھی، جو دریائے لطافت کے نام سے مشہور ہوئی۔

مصنف کے بقول اردو میں سب پہلے جس شخص نے اپنی توجہ قواعد نویسی کی طرف مبذول کی وہ سر سید احمد خان تھے اس سلسلے میں انہوں نے ان کی کتاب 'قواعد صرف نحو اردو' کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد اردو میں قواعد نویسی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، مگر ان قواعد کی کتابوں میں ایک چیز جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ کہ ان سب کا طرز تصنیف بالعموم تدریسی ہے یعنی تدریس کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

نواں مبحث'' پانی اور اس کی اشٹا دھائی'' ہے۔ ہندوستان اپنی جن بعض خصوصیتوں کی بدولت دور قدیم سے ہی مغربی ممالک پر فوقیت رکھتا ہے، اس میں ایک پانی اور اس کی اشٹا دھائی بھی ہے یہ پانی کا ایک عظیم الشان وعدیم المثال لسانی کارنامہ ہے جس کو بجا طور پر مغربی دنیا نے بھی سراہا ہے۔ مصنف کے بقول یہ ایک جامع، مکمل اور منضبط سنسکرت زبان کی قواعد ہے۔

اس کتاب کا دسواں مبحث ہے'' سید محی الدین قادری زور کا نظریہ آغاز زبان اردو'' پچھلی صدی میں جن اہم شخصیات نے اپنا نام ماہر لسانیات کی حیثیت سے زندہ و تابندہ کیا ہے ان میں محمود خان شیرانی، محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خان کے اسماء خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر چہ تینوں شخصیتیں ایک دوسرے کے ہم عصر تھیں مگر بقول شاعر:

موت سے کس کو رستگاری ہے

۔ان میں سب سے پہلے محمود خان شیرانی وفات پا گئے، اس کے بعد محی الدین قادری زور۔ مسعود حسین خان ان دونوں کے بعد بھی زندہ رہے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ان تینوں کا مشترکہ موضوع لسانیات ہی تھا مگر موخر الذکر نے ان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق اپنا ایک الگ ہی نظریہ قائم کیا تھا جس پر مصنف نے ذیل میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کا گیارہواں مبحث ہے'' مسعود حسین خان کی لسانی تحقیق'' مسعود حسین خان کا شمار ان شخصیتوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے تعلیمی مشن کی تکمیل انگلستان اور فرانس کے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہ کر کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ امریکہ بھی گئے بعد میں انہوں نے اپنے وطن میں رہ کر کم و بیش تین نسلوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیے جن سے متعلق باصلاحیت افراد آج بھی علمی اور تحقیقی میدانوں میں سرگرم و سرگرداں ہیں۔

مصنف نے ان کے علمی و تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے، ان کے پانچ ایسے قدیم ادبی متنوں کا ذکر بھی کیا ہے جس کی ترتیب و تدوین کے فرائض انہوں نے بڑی ہی دقت نظری و عرق ریزی سے انجام دیے، جو آج بھی نمونے کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، وہ متون یہ ہیں:

بکٹ کہانی (محمد افضل افضلؔ) قصہ مہر افروز و دلبر (عیسوی خان بہادر) عاشور نامہ (روشن علی) پرت نامہ (فیروز بیدری) ابراہیم نامہ (عبدل دہلوی)۔

بارہواں مبحث گوپی چند نارنگ کی لسانی فکر اور بصیرت ہے۔'' گوپی چند بنیادی طور پر لسانیات کے آدمی ہیں دوسری طرف یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دو دہائیوں سے اردو میں جو تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں، چاہے وہ ساختیاتی ہو یا پس ساختیاتی، روسی ہیئت پسندی ہو یا

مظہریت یا مابعد جدیدیت کہیں نہ کہیں ان کا تعلق ان تنقیدات سے بھی ہے، گوپی چند نارنگ نے بڑی ہی دقت نظری سے ان موضوعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ اردو ادب پر جدیدیت کی جکڑ اتنی زیادہ مضبوط تھی کہ اردو تنقید کا اس سے باہر نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا وہ گوپی چند نارنگ ہی ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو اس تنگنائے سے باہر نکالا۔ان کی کتابیں 'قاری اساس تنقید' 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، اردو ما جدیدیت پر مکالمہ، اور جدیدیت کے بعد وغیرہ اس موضوع پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بعضوں نے گوپی چند نارنگ کے تعلق سے مصنف کے اس خیال سے اختلاف بھی کیا ہے جس میں ڈاکٹر یوسف سرمست کا نام سرفہرست ہے وہ اپنے ایک مضمون میں گوپی چند نارنگ کا نام لئے بغیر لکھتے ہیں:

'' اردو میں ہمارے ایک نقاد نے ساختیات کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے۔معلوم یہ ہوا کہ یہ ان کا ایک پروجیکٹ ہے جس کا بوجھ ہمارے جدید نقاد مجموعی طور پر ڈھو رہے ہیں اور ان نقادوں کی علمیت کے بوجھوں تلے اردو تنقید دبی جارہی ہے بہرحال انہوں نے نہ بہت کچھ لکھا ہے بلکہ مختلف مقامات پر اس موضوع پر لکچر بھی دیے ہیں لیکن ان کی تشریحات اور وضاحتیں شاید ہی کسی کے پلے پڑی ہوں (ص ۔73 جدیدیت اور عصری تنقید بحران (مضمون): یوسف سرمست ۔معاصر اردو تنقید۔مرتب :شارب ردولوی۔اردو اکیڈمی دہلی۔سن اشاعت 1994)

ظاہر ہے یوسف سرمست کے اس خیال سے ناقدین فن کا اتفاق کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔حقیقت یہ کہ گوپی چند نارنگ نے ان رجحانات کی صرف نظریاتی ہی تشریح وتعبیر نہیں کی بلکہ اردو کی کلاسیکی اور جدید شاعری اور فکشن کا ان رجحانات کی روشنی میں تجزیہ بھی پیش کیا۔

تیرھواں مبحث ''اردو زبان کی پہلی سلینگ لغت'' ہے۔اردو زبان وادب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے الفاظ ومحاورات اسماء وضمائر کو اس طرح سے اپنے اندر سموئے ہوئی ہے کہ وہ اسی زبان کے لگتے ہیں۔اس باب میں مصنف نے رؤف پاریکھ کی سلینگ (Slang) لغت کا جائزہ لیا ہے۔سلینگ انگریزی زبان کا لفظ ہے چونکہ فی الحال اس کا کوئی متبادل اردو میں نہیں ہے لھذا یہی لفظ رائج ہے۔بقول مصنف:

''سلینگ'' سے بالعموم عوامی ،عامیانہ ،سوقیانہ نیز غیر ثقہ الفاظ و محاورات مراد لئے جاتے ہیں۔سلینگ اصطلاح اکثر بازاری ،مبتذل یا غیر رسمی زبان کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔اس لئے جو الفاظ سلینگ کا درجہ رکھتے ہیں انہیں معیاری مستند یا ٹکسالی ذخیرہ الفاظ کا حصہ نہیں سمجھا جاتا اور نہ انہیں کسی معیاری لغت میں جگہ دی جاتی ہے'' مصنف نے اصل کتاب سے کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں جو بڑی ہی دلچسپ ہیں۔

چودھواں مبحث ''اردو - انگریزی لغت مجتہدی'' ہے ۔یہ لغت محض مجموعہ الفاظ ومحاورات پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بقول مصنف:

''لغت مجتہدی محض گنجینہ لفظ ومعنی ہی نہیں بلکہ یہ اندراجات سے متعلق صوتی ،صرفی ،قواعدی تاریخی ،ادبی اور لسانی معلومات کا بھی بہترین ذریعہ ہے، نیز اس میں فقروں اور جملوں کی مدد سے بے شمار الفاظ کے استعمال کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں'' جس کے علمی وادبی نگارشات سے حوالے بھی پیش کئے گئے ہیں۔مصنف کا خیال ہے کہ یہ لغت لفظ ومعنی سے متعلق تمام تر ضروری معلومات فراہم کرتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایک جامع مکمل ومستند ذولسانی (

Bilingual) لغت ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

پندرھواں مبحث ''اردو زبان کی تعلیم و تدریس (مسائل و امکانات) ہے۔ یہ اس کتاب کا آخری مبحث ہے۔

ہر چیز کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے، آج زمانہ ترقی کے بہت سارے مدارج طے کر چکا ہے۔ مثال کے طور پر آپ زبان کو ہی لے لیں اگر پرانے طریقے سے سکھائی جائیں تو یہ عمل اکتا دینے والا نہیں بلکہ بہت ممکن ہے نفرت پیدا کرنے کا باعث بھی بن جائے۔ آج زبانیں جدید طریقوں کی مدد سے بہت اچھے طریقے سے سکھائی جا سکتی ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ آج لینگویج لیب (Language Lab.) فونیٹک لیب (Phonetic Lab) اسی طرح سے ریڈیو، ٹیلی ویژن کے استعمال سے بھی تدریس زبان کے طریقے کو نہ صرف موثر اور آسان بلکہ بے حد دلچسپ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اب انٹرنیٹ اور سافٹ ویئر کی مدد سے بھی زبان کو سیکھنے اور سکھانے کا طریقہ ایجاد ہو گیا ہے جس سے گھر بیٹھے یا چلتے پھرتے زبان سیکھی جا سکتی ہے۔ اردو داں طبقے کو زبان کی تدریس میں ان طریقوں کو خصوصیت کے ساتھ استعمال میں لانا چاہیے۔

یہ تو تھا زیر نظر کتاب 'لسانی مسائل و مباحث' کا مختصر سا جائزہ۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کی یہ تصنیف میرے نزدیک اس لئے بھی اہم ہے کہ پروفیسر موصوف نے عام ماہر لسانیات کے بر عکس اردو کا رشتہ پہلی مرتبہ 1000 سنہ عیسوی کے آس پاس سے جوڑا ہے اسی طرح پروفیسر موصوف کو اس امر میں بھی اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اردو کو پورے وثوق کے ساتھ کھڑی بولی کی زائیدہ و پروردہ بتایا ہے، اسی طرح انہوں نے انگریزوں کی اس سازش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے کس طرح سے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی کے تحت اردو کو دو پھاڑ کر کے اس کے بطن سے ہندی کو ناجائز طور سے جنم بخشا۔ انہوں نے اس بات کی بھی کھل کر تردید کی کہ چونکہ اولیت کا سہرا اردو کے سر ہے اس لئے اردو کسی بھی قیمت پر ہندی کی شیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر چونکہ ہندی اردو سے نکلی ہے اس لئے ہندی کو اردو کی شیلی کہنا زیادہ موزوں و مناسب ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اردو زبان پوری طرح سے یہاں کے ماحول، تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے۔

اس کتاب کی اردو میں تصنیف کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں خصوصیت کے ساتھ ہندی میں ہوتا کہ اردو مخالفین بھی اس حقیقت سے آشنا ہو جائیں جسکی پردہ کشائی پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی اس تصنیف میں کی ہے۔ مجھے گمان ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے کہ اس کتاب کو جہاں اردو دنیا میں اضافے کی حیثیت حاصل ہوگی وہیں یہ اردو داں طبقے میں سند اور ماخذ کی حیثیت بھی حاصل کرے گی۔

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام

ہندوستانی ادب کے معمار

کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے

ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ،

نئی دہلی 001 110

سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

فیروز عالم

تبصرہ

سرسید شناسی میں ایک اہم اضافہ: ''سرسید اور اردو زبان وادب''

پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی کا شمار جدید دور کے سنجیدہ اور اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں ان کی سترہ اٹھارہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ موصوف نے کئی اہم داستانوں اور مثنویوں مثلاً ''سب رس''، ''باغ و بہار''، ''سحرالبیان'' اور ''گلزار نسیم'' کی تدوین کے علاوہ ''اردو داستان: تحقیق وتنقید'' اور ''طلسم ہوش ربا: تنقید وتلخیص'' جیسی اہم کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ ان کی کتاب ''سرسید اور اردو زبان وادب'' پہلی بار 1989 میں شائع ہوئی تھی۔ اب ترمیم واضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے سرسید کی تمام تصانیف سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور ادب کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات، ان کے اسلوب، تصور شعر و ادب، صحافت اور ملی خدمات سے بخوبی واقف کرایا ہے۔

پہلے باب ''سرسید اور اردو زبان وادب'' میں پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے سرسید کی اردو سے محبت اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ان کی عملی کوششوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ سرسید نے ایک ورنا کلر یعنی دیسی زبان کی یونیورسٹی کا خاکہ بھی پیش کیا تھا۔ اس میں اردو بھی بحیثیت ذریعہ تعلیم شامل تھی۔ سرسید جانتے تھے کہ بچے کی مناسب تعلیم جس قدر مادری زبان میں ہوسکتی ہے اتنی کسی اور زبان میں نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں درسی کتابوں کی تیاری کے مسائل اور بعض دیگر وجوہ سے سرسید احمد خاں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور جب ایم اے او کالج کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا نیز وہ اردو کی ایک ایسی لغت بھی تیار کرنا چاہتے تھے جس میں الفاظ کے معنی، ان کی جنس اور دیگر تفصیلات درج ہوں لیکن افسوس کہ یہ دونوں منصوبے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ اس باب میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے آغاز، اغراض و مقاصد اور تاریخ سے بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ مصنف نے ''خطبات احمدیہ'' سے متعلق ایک عام غلط فہمی بھی حوالے کے ساتھ دور کی ہے۔ اس سے متعلق مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

''شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کی تحقیق ہے کہ ''جب کتاب اردو میں تیار ہوگئی تو سرسید نے اس کا ایک خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اور اسے 'ایسز آن دی لائف آف محمدؐ' [صلی اللہ علیہ وسلم] کے نام سے لندن ہی میں 1870 میں شائع کر دیا۔''

عام طور پر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ دراصل سرسید نے وسائل کی کمی کے سبب، میور کی کتاب کے بعض قابلِ گرفت مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں اظہارِ خیال کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ایک رسالہ مکمل ہوا، انھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کروایا جو کہ 1869 میں Trubner & Co. کے زیرِ اہتمام لندن سے شائع ہوا۔ اسی سال ایک اور کتابچہ مذکورہ کمپنی کی نگرانی میں طبع ہوا۔ اور اشاعت کا یہ سلسلہ 1870 تک جاری رہا۔'' (سرسید اور اردو زبان وادب۔ صفحہ۔ 17)

سرسید نے جب تہذیب الاخلاق جاری کیا تو جہاں

دیگر اصلاحی اور علمی مضامین شائع کیے وہیں ایک تفصیلی مضمون ''علاماتِ قرأت'' کے نام سے رموز اوقاف کی اہمیت، افادیت، نام اور محلِ استعمال پر بھی لکھا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زبان کے کن کن گوشوں پر ان کی نظر تھی۔

کتاب کے دوسرے باب ''سرسید کا اسلوبِ نگارش ''میں مصنف نے زمانی اعتبار سے سرسید کی تحریروں میں آنے والی تبدیلیوں سے واقف کرایا ہے۔ابتدا میں زمانے کے مروجہ اصولوں کے تحت انھوں نے بھی مقفّٰی و مسجع عبارتیں لکھیں۔مثال کے طور پر ان کی پہلی تصنیف ''آثارالصنادید'' (1847) کے آخری باب کی نثر پیش کی جاسکتی ہے۔اگرچہ مولانا حالی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ منشی امام بخش صہبائی نے لکھا تھا۔1854 میں جب ''آثارالصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری شروع ہوئی تو سرسید نے اکثر مقامات پر زبان میں تبدیلیاں کیں اور کتاب کا چوتھا باب نکال دیا۔اکبرآبادی مسجد کا ذکر ان دونوں ایڈیشنوں میں الگ انداز میں ملتا ہے۔متن ملاحظہ کیجیے۔:

پہلا ایڈیشن۔ ''اسی بازار میں یہ ایک مسجد ہے، دل کش و دل ربا، فرحت بخش و روح افزا، سر سے پاؤں تک سنگِ سرخ کی، اور گرد اس کے مکانات اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر یہ مسجد بنائی ہے۔.....جس کی عظمت و جلال کے آگے ملاء اعلیٰ گرد ہے۔اس مسجدِ فیض بنیاد کو اعزاز النسا بیگم بیوی شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے ۱۰۶۰ھ میں مطابق ۲۴ جلوس کے بنائی ہے۔ان بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا۔اس سبب سے یہ مسجد بھی اکبرآبادی مسجد مشہور ہوگئی ہے۔'' (بحوالہ سرسید اور اردو زبان و ادب، صفحہ:40)

دوسرا ایڈیشن۔ ''شہر شاہ جہاں آباد کے فیض بازار میں یہ مسجد واقع ہے۔نواب اعزاز النسا بیگم عرف اکبرآبادی بیگم زوجہ شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کے یہ مسجد بنائی۔'' (بحوالہ سرسید اور اردو زبان و ادب، صفحہ:41)

اندازہ لگائیے صرف سات برس کے قلیل عرصے میں ان کی سوچ میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی کہ انھوں نے مبالغہ آمیز الفاظ، تراکیب اور جملوں کو حذف کر کے آسان اور سادہ انداز میں اپنی بات کہنی شروع کر دی تھی۔فریدی صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ سرسید زبان و بیان کی لطافتوں کے قدرداں تھے لیکن وہ نثر کو شعر بنانے کے قائل نہ تھے۔سرسید کا اسلوب وضاحت، قطعیت اور استدلال سے عبارت ہے۔مصنف نے سرسید کے اسلوب کی دیگر خصوصیات مثلاً سادگی، تکرارلفظی، متروکات اور انگریزی الفاظ کے استعمال پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب ''سرسید کا تصور شعر و ادب'' ہے۔اس کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید افادی ادب کے قائل تھے اور وہ چاہتے تھے کہ شعر و ادب کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگایا جائے اور اس سے عوام کے مسائل کو حل کرنے میں مدد لی جائے۔افادی مقصد کے تحت ہی انھوں نے اپنی تحریروں میں سادہ اور آسان زبان استعمال کی۔اسی لیے وہ کہتے تھے کہ پر تکلف جملے، دو چار صفحات لکھ دینا'' کچھ بڑی بات نہیں ہے، مشکل کام مطلب نگاری ہے۔.....جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔'' (بحوالہ سرسید اور اردو زبان و ادب، صفحہ:70)

چوتھے اور پانچویں باب میں بالترتیب ''سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی : اغراض و مقاصد، احوال و کوائف'' اور ''سائنٹفک سوسائٹی: اردو زبان کے ارتقا کی ایک کڑی'' کے زیر عنوان پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کی غرض و غایت، اس کے تنظیمی ڈھانچے، اس سے وابستہ افراد اور اس

کی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی صرف مسلمانوں کی تعلیمی فلاح کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن اس کتاب میں مصنف نے سرسید کے ایک مضمون کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اس کے مخاطب ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ مذکورہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں اس ادارے کے مقاصد بیان کیے گئے تھے۔

''ایسی بد بخت حالت کے علاج کی راہ نکالنے اور ہمارے ہم وطن ہندوؤں اور مسلمانوں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا ـــــ اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا، دوسرے انگریزی زبان سے اور اور زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لیے مفید ہوں۔'' (بحوالہ سرسید اور اردو زبان وادب، صفحہ:80)

اس بات کا علم بھی کم لوگوں کو ہوگا کہ جس وقت سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہوئی اس وقت یہ طے کیا گیا گیا تھا اس کا صدر مقام آخر کو الٰہ آباد ہوگا لیکن بعد میں جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا اور ان کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہوگیا تو اس کا صدر مقام بھی الٰہ آباد کی بجائے علی گڑھ میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سوسائٹی کی جانب سے ابتدا میں تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، علم طبقات الارض اور دیگر علوم کی اٹھائیس کتابوں کا ترجمہ کرانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بعد میں مزید اٹھارہ کتابیں اس فہرست میں شامل کی گئیں۔ افسوس کہ مالی دشواریوں کی وجہ سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوسکیں جن میں سے پروفیسر اصغر عباس کی تحقیق کے مطابق صرف گیارہ کتابیں دستیاب ہیں۔ کتاب میں ان تمام کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن کے ترجمے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

''سرسید: بحیثیت صحافی'' اس کتاب کا آخری باب ہے جس میں مصنف نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے سرسید کی صحافتی خدمات، ان کی اصول پسندی، صحافتی قدروں کی پاس داری، دیانت داری اور خلوص پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں فریدی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سرسید آزادی رائے کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے عوامی مسائل سے حکومت کو واقف کرانے، سماجی اور معاشرتی مسائل حل کرنے، تعلیم کی افادیت سے واقف کرانے اور جدید علوم وفنون کی اہمیت سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ ان کے سامنے ملک اور قوم کی تعلیمی اور سماجی ترقی کا ایک عظیم مشن تھا اور اس کی تکمیل کے لیے انھوں نے صحافت کا بھرپور استعمال کیا۔

زیر نظر کتاب اگرچہ بہت ضخیم نہیں ہے لیکن اس کے مشمولات اور پیش کش کے انداز نے اسے بے حد اہم بنا دیا ہے۔ مصنف نے نہایت مدلل اور دوٹوک انداز میں اپنی بات نہایت اختصار کے ساتھ پیش کی ہے۔ کہیں بھی انھوں نے مبالغے یا غیر ضروری تفصیل سے کام نہیں لیا ہے۔ انھوں نے کتاب میں وہی انداز اور اسلوب اپنایا ہے جو تحقیق وتنقید کے لیے موزوں ہے۔ اردو ادب کے قارئین اور سرسید کے شائقین کے لیے ''سرسید اور اردو زبان وادب'' ایک انمول تحفہ ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، یوپی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

OOO

سب رس

میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور تخلیقات

شائع ہوتے ہیں۔

تبصرہ

صحافتی مضامین اور ملاقاتیں.....

دنیائے صحافت میں جناب قطب الدین خان کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔وہ ایک عرصے سے اخبارات کے لیے لکھ رہے ہیں۔علاقائی، ملکی، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر انھیں بے باکانہ انداز میں مدلل تحریریں رقم کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔قطب الدین خان صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ سلگتے ہوئے موضوعات اور دہکتے واقعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہمیشہ انسانی سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔رواں سال ان کے مضامین اور مصاحبوں پر مشتمل تحریروں کی ایک اہم کتاب ''صحافتی مضامین اور چند ملاقاتیں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے جس میں تقریباً تینتیس (۳۳) مضامین اور مصاحبے شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیاسی، سماجی، قومی، ملی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی سطح پر یہ کافی وقیع تحریریں ہیں جن میں قوم وملت کو درپیش چیلنجس کے بارے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ دانشورانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔عالمی سطح پر خارجی اور داخلی سطحوں پر موجود حساس مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے اور مسائل کے حل کی طرف بھی توجہ دہانی کی گئی ہے۔بالخصوص عصر حاضر میں مسلمانان عالم کے حال زار، اقوام عالم کا کردار اور دنیا کے تمام قابل ذکر ممالک کی صورتحال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے واشگاف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔وہ چاہے تقسیم ہند کے اسباب وعلل کا تذکرہ ہو، چاہے پولیس ایکشن کی خوں آشام تاریخ ہو یا قانون وقیادت کا ذکر قطب الدین خان صاحب نے بیّن اور پراثر طریقے سے اپنی بات پیش کی ہے۔''حیدرآباد پر پولیس ایکشن کی تاریخ۔ابتدا سے انتہا تک'' ایک ایسا مضمون ہے جس کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ پولیس ایکشن کی قیامت صغریٰ کا احوال بیان کرتے ہوئے انھوں نے چند فکر انگیز انکشافات کئے ہیں۔سندر لال کمیشن کی رپورٹ، مولانا آزاد کی بے بسی اور سردار پٹیل کی مسلم دشمنی کے واقعات کا احاطہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''حیدرآباد کی جمعیۃ العلماء کا ایک وفد (جس میں حافظ ابو یوسف جیسے قائدین بھی شامل تھے) دہلی پہنچا اور پولیس ایکشن کی تباہی کے اعداد و شمار مولانا آزاد کو پیش کئے۔مولانا آزاد نے اس وفد کو یہ اعداد وشمار پنڈت نہرو کے گوش گزار کرنے کو کہا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس وفد کو ان واقعات کے ذمہ دار (وزیر داخلہ) سردار پٹیل کے پاس جانے کو کہا۔ سردار پٹیل کا رویہ یہاں بھی قاہرانہ تھا، سردار پٹیل نے وفد کے اعداد وشمار کا مطالعہ کیا اور وفد کو دوسرے دن آنے کو کہا دوسرے دن جمعیۃ العلما کا وفد جب سردار پٹیل کے پاس پہنچا تو سردار پٹیل نے وفد سے کہا کہ

پولیس ایکشن کے بعد ہندوؤں
کے مظالم کے اعداد وشمار تو آپ
لے آئے لیکن پولیس ایکشن سے
پہلے حیدرآبادی مسلمانوں نے
حیدرآبادی ہندوؤں کے خلاف جو
کچھ کیا اس کے اعداد وشمار آپ
نہیں لائے۔ سامنے الماری میں
پولیس ایکشن سے پہلے ہندوؤں
پر مظالم کے اعدادوشمار ہیں انھیں
دیکھ لیجئے۔ سردار پٹیل کا جواب سن
کر جمعیۃ العلما کا وفد خاموشی سے
وہاں سے نکل گیا'' (ص ۱۳۵)

''سابق وزیرِ اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف سے جدہ میں ملاقات''

''کامیاب مسلم قیادت کا بے مثال نمونہ۔ سالارِ ملت''

''پاکستان سے جنگ موجودہ مسائل کا حل نہیں''

(سلمان خورشید سے گفتگو)

''کرپشن، غربت اور ناانصافیاں ۶۸ سالہ آزادی کے ثمرات.....''

''ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل''

(ماہر معاشیات)

''مہاتما گاندھی اور گاؤکشی پر پابندی'' کے علاوہ ''خواتین قیدیوں کی جیلوں میں بے بسی اور حالت زار، سیاست زدہ ہندوستانی اسپورٹس ایوارڈ، اذیت رسانی (Torture) ملزمین سے زبردستی جرم اگلوانے کا عام ہتھیار، فاقہ کشی اور تیار شدہ غذا کا اتلاف، حیرت انگیز متضاد صورتحال، کیا ملک کے معدنی وقدرتی ذخائر پر عام آدمی کا حق نہیں؟'' ''کارٹون یا خاکہ نگاری کی صحافت میں اہمیت'' اور ''شاہ فہد بن عبدالعزیز کا ۲۰ سالہ دور حکمرانی'' وغیرہ کے خاصے مضامین ہیں۔ جن میں ڈھیر ساری اہم باتوں کا ذکر ہے جس سے وقت اور وقت کی چال، سماج و سیاست کی رفتار کا پتہ چلتا ہے۔ مشہور زمانہ سیاسی، سماجی اور علمی شخصیتوں سے مصاحبے خوب مطالعہ کے قابل ہیں۔ نپی تلی گفتگو، کارآمد موضوعات کا انتخاب سلیس اور پراثر زبان کا استعمال پیش نظر کتاب میں شامل مضامین کی وقعت کو دوچند کر دیتا ہے۔ معیاری، شستہ وشگفتہ اردو میں رقم کی گئی یہ خالص صحافتی تحریریں موضوع اور مواد کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہیں، جن میں ہندوستان جنت نشان کی ندیوں کے پانی کی سرسراہٹ بھی ہے اور خلیجی نخلستانوں کی فرحت بخش ہواؤں کا لمس اور روح افزا خوشبو بھی۔ الغرض صداقتوں کی دھوپ میں بیٹھ کر لکھی گئی یہ حقائق پر مبنی تحریریں قاری کے لیے ایک شجر سایہ دار کی طرح دلکش و دلنشین ہیں۔ تمام تر خوبیوں کے باوجود کتابت کی غلطیاں شامل ہیں۔ ۲۲۲ صفحات پر مشتمل اس دیدہ زیب اور معلوم آفریں کتاب کو نہیان پبلی کیشنز Grace Aprt, 4th floor, flat No. 408 ہمایوں نگر سے صرف 150 روپئے میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

جو وہ لکھیں گے جواب میں

محترم پروفیسر بیگ احساس صاحب

مدیر سب رس حیدرآباد۔ السلام علیکم!

اس بار نومبر 2017ء کا سب رس ایک ہفتہ تاخیر سے ملا۔ اس ماہ کے سب رس میں آپ کا اداریہ خانگی اسکولوں اور کالجوں کو نشانہ بنایا ہوا ہے! آپ کا کہنا ہے آزادی سے قبل سرکاری مدارس تمام سہولتوں سے آراستہ ہوتے تھے اور اسی وجہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو انہیں سرکاری مدارس میں ہی پڑھاتے تھے۔ آزادی سے پہلے شاید خانگی اسکولوں اور کالجوں کا وجود تھا۔ یا نہیں؟ نہیں تھا۔ اس لیے امیر لوگوں کے بچے انہیں سرکاری اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ اب یہ صورت نہیں رہی! آزادی کے بعد سے سرکاری اسکولوں کا معیار گرنا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سرکاری اسکولوں میں لوگوں نے اپنے بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیا اور خانگی اسکولوں کی طرف رجوع ہوئے۔ جب ایسی صورت حال ہوئی تو جا بجا خانگی اسکولوں کو قایم کیا جانے لگا۔ بقول آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے خانگی مدارس ایک بڑی انڈسٹری بن گئے۔ جن کا کام صرف روپیہ کمانا ہے اور اس کام میں سیاسی لوگ جیسے ایم پی/ایم یل لے شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا نواب شاہ عالم خان کے بارے میں مضمون مرحوم کو خراج عقیدت ہے، پسند آیا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کی تحریروں میں جو مزاح ہوتا ہے اس مضمون میں بھی نظر آیا۔ دوسرا مضمون عبدالصمد صاحب کا اماوس میں خواب۔ ایک تحریر دستاویزی ہے جو حسین الحق کے ناول اماوس میں خواب کے بارے میں ہے پسند آیا۔ تیسرا مضمون اسیم کاویانی صاحب کا ہے جس کا عنوان ہے ''وہ کاغذ کی کشتی'' وہ بارش کا پانی عنوان جتنا خوب صورت ہے مضمون بھی اتنا ہی خوب صورت لکھا گیا ہے، جس میں اسیم صاحب نے اپنے عہد طفلی میں ہوئے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ بچپن میں جو بمبئی (اب ممبئی) دیکھی تھی بڑے ہی خوب صورت دل کش انداز میں، ان چھوٹے بڑے واقعات جو ان کے بچپن سے جڑے ہیں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون پڑھتے پڑھتے میں تو اس ممبئی کی سیر کرنے لگا جہاں اب یادیں ہی یادیں ہیں:

دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

اپنے اس مضمون میں اسیم صاحب نے ایک تاریخی واقعہ کوٹ کیا ہے: جارج واشنگٹن کے بجائے امریکی صدر ابراہم لنکن کا نام لیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جو میں نے اپنے اسکول کے زمانے میں آٹھویں یا نویں جماعت میں انگریزی سبجکٹ میں Non-Detailed پڑھی تھی اس میں ایک سبق تھا Dignity of Labour اور اس میں امریکی صدر جارج واشنگٹن کا ذکر ہے۔

وسیم بیگم کا تنقیدی مضمون ''مابعد جدیدیت نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں'' کی پہلی قسط پڑھنے کو ملی۔ کافی محنت سے لکھا گیا اس مضمون میں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں Clear نہیں ہے۔ دیکھنا ہے اگلی قسط میں کیا پڑھنے کو ملتا ہے۔

''مولانا آزاد کی شعری بصیرت غبار خاطر کے آئینہ میں'' شاہد نوخیز اعظمی کا مضمون مختصر ہونے کے باوجود کافی معلومات دیتا ہے۔

باقی مشمولات میں آپ بیتی (یادیں) ،سفرنامہ ''آوارگی تھوڑی سی'' اور خامہ بگوش کا جانِ عالم کا پری خانہ اور ریڈیو پاکستان'' پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

افسانوں میں اشتیاق سعید کا ''بعید از قیاس'' اور علی نثار کا ''نجات'' شامل ہے۔ اشتیاق صاحب کا افسانہ پہلے ماہ نامہ ایوان اردو، نئی دہلی میں چھپ چکا تھا۔ اشتیاق بھائی سے اس افسانے (بعید از قیاس) کو سب رس نومبر 2017ء میں شائع کروادیا ہے' جب کہ سب رس میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

آخر میں ایک ضروری بات! سب رس انٹرنٹ پر شعر و سخن کی ویب سائیٹ (ٹورنٹو کینیڈا سے تقریباً 2003ء سے ہے) پر شائع ہوتا رہا ہے۔ فروری 2017ء کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ مگر سب رس کے ہر شمارے میں یہ اشتہار اعلان ہوتا رہا ہے کہ سب رس انٹرنٹ پر دستیاب ہے۔

محبوب پاشاہ اعظمی، چینائی

پروفیسر بیگ احساس صاحب ___ السلام علیکم!

ڈاکٹر محمود شیخ جبل پور کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مضمون بہ عنوان ''مابعد جدیدیت، نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں'' کی ایک قسط پڑھ کر اپنی رائے قایم کی، انھوں نے تہذیبی اور ثقافتی قدروں پر بات کی، وہ تو مقامی ہوتی ہی ہیں دلی کی تہذیب اور ثقافت کو حیدرآباد یا لکھنوی تہذیب و ثقافت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہر مقام کی تہذیب میں اس دور کے تمام عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو داخلی بھی ہوتے ہیں اور خارجی بھی، ہم کسی بھی مقام کی تہذیب و ثقافت کو وہاں کے مقامی رنگ سے کیسے الگ کر سکتے ہیں؟ دلی اور لکھنو کی الگ الگ تہذیب ہے جن پر وہاں کا مقامی رنگ پوری طرح عیاں ہے (تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے) اسی تہذیب و ثقافت کا عکس یہاں کے شعر و ادب میں بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے، دوسرے نکات پر آپ نے روشنی ڈالی مثال کے طور پر Live in Relationship, Contract Marriage وغیرہ ہم جنسی.....ان نکات پر تو اس مضمون میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ مابعد جدیدیت جو ایک رجحان ہے اب وہ ہندوستان کی مختلف ادبیات کے ساتھ اردو ادب میں بھی سرایت کر چکا ہے، اردو والے کسی بھی تبدیلی کو مشکل سے اخذ و قبول کرتے ہیں، یہی مابعد جدیدیت کے ساتھ بھی ہو رہا ہے اس رجحان کو سمجھنے کے لیے مشرقی زبان و ادب کے ساتھ مغربی ادب کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

وسیم بیگم۔ حیدرآباد

محترم بیگ صاحب تسلیمات!

پہلی بار سب رس سے متعارف ہوا اپنی ناوقفیت کا دکھ ہوا، اتنے خوبصورت اور معیاری رسالے سے اب تک محروم رہا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے شہر میں صرف ایک اردو کتابوں کی دکان ہے، جہاں وہی رسائل آتے ہیں جو عموماً دلی، کلکتہ یا بمبئی سے شائع ہوتے ہیں یعنی اردو رسالوں کے لئے ہم لوگ انکی مرضی پر منحصر رہتے ہیں۔ بہر حال سب رس کا دیدار ہوا مسلم لائبریری سے جہاں کا وئسل برائے فروغ اردو زبان کے توسط یہ سے آتا ہے۔ دسمبر کا سب رس بہت خوبصورت ہے خاص کر آپ کا اداریہ ملک کی حالیہ صورت حال پر بے شمار سوالات کرتا ہے مگر سرکار کی سرد مہری ایک خوف کا ماحول بنا رہی ہے۔ کون جانے اس کی انتہا کیا ہوگی۔ ملک کو یہ عناصر جن سمت لے کر جا رہے ہیں اس کا منظر انتہائی خوفناک ہے اللہ سے دعا ہے ملک کے حالات صحیح رہیں۔

میری دلی مبارکباد قبول کریں آپ کے اردو افسانوں کے لئے اس سال کا ساہتیہ اکیڈمی اعزاز ملنے پر۔ بہت دنوں بعد کسی جینوئن ادیب کو اس اعزاز سے نوازا گیا، مزید مبارکباد۔ سب رس دیکھ کر جی کیا اس میں اپنی غزلیں برائے اشاعت بھیجوں سو بھیج رہا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ سب رس کے معیار کے مطابق ہونگی۔ کسی قریبی شمارے میں شامل اشاعت کرلیں عنایت ہوگی۔ اسی سال میرا پہلا مجموعہ کلام بنام 'عکس خوشبو کے' منظر عام پر آیا اللہ کا لاکھ کرم ہے کہ دوستوں نے پہلے ایڈیشن کی نصف کاپیاں لے لیں اور جو باقی رہ گئیں تھیں قومی کاونسل برائے فروغ اردو زبان نے بلک پر چیز اسکیم کے تحت خرید لی۔

انور ادیب۔ جھارکھنڈ

برادرم بیگ احساس _____ سلام ونیاز!

سب رس کا دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسب معمول و محمول آپ کا سیاسی اداریہ بعنوان ''بربریت ولاقانونیت'' مطالعہ سے گزرا جس میں آپ نے ہندوستان کے سیاسی حالات حاضرہ کا احاطہ کیا ہے۔ بربریت اور لاقانونیت کے شکار افروز کا قتل اور ہادیہ اور شفیع جہاں کی شادی کو خواہ مخواہ بقول آپ کے ایک بے معنی اور زہریلی اصطلاح ''لو جہاد'' ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے اور اس سارے معاملے میں ہادیہ کی ثابت قدمی بے مثال ہے سابق کانگریس وزیر ششی تھرور کا ایک بیان اخبار میں میری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے موجودہ حکمران جماعت کی دقیانوسی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمارے لیے وہ وقت آگیا کہ ہم کیا کھائیں اور کیا پئیں، نوالے کیسے اور کیوں کر اٹھائیں اب ان مہاشوں سے پوچھنا ہوگا بقول اسدالدین اویسی سہ طلاقی جیسے مدوں کو پارلیمنٹ میں پاس کروانے کا Credit اپنے سر لینے والے مودی پر علی الاعلان طنز کیا ہے اور بقول آپ کے گجرات Election میں وزیر اعظم کے بیان میں ایک حیرت ناک دقیانوسی سوال کہ راہول گاندھی رام مندر کے حق میں ہیں یا بابری مسجد کے؟؟ یہ بات موجود جمہوری عوام کے لیے تشویش ناک ہے۔

اس سال غالب اکیڈیمی نے جو ایوارڈ کا اعلان کیا ہے ان ایوارڈز کے حاصل کرنے والوں میں صرف پروفیسرز اور ڈاکٹرس کے نام دیکھ کر حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ کیا کوئی ان کے علاوہ ادیب اور شاعر جن کا کسی یونیورسٹی سے تعلق نہیں ہے ان ایوارڈز کا مستحق نہیں ہے یہ یک طرفہ ستائش وصلے کا سلسلہ پتہ نہیں کب تک جاری رہے گا۔

کیا محبوب راہی، خلیل مامون، کوثر صدیقی، حلیم صابر، رؤف خیر، علی منیر، ش ک نظام، افتخار امام صدیقی اس ایوارڈز کے مستحق نہیں ہیں۔ اردو زبان و ادب میں اجارہ داری کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے۔

مضامین میں سید تقی عابدی، وسیم بیگم، فرحانہ انجم اور اشرف رفیع کی تحریروں نے ذہنی دریچوں میں معلوماتی خوشبوئیں بکھری ہیں۔ حمید سہروردی نے داغ کے اشعار کو سمیٹ کر یادوں کو نئی زندگی بخشی ہے۔ غزلیات کے طغرے بھی خوب صورت، دیدہ زیب اور فکر کشا لگے۔ بالخصوص حامدی کاشمیری کی فکری وسعتوں میں ڈوب کر میں خود کو تلاش کر رہا ہوں۔ اور ایک مصرع آپ کی نذر ہے۔

ع خود میں خود کی تلاش جاری ہے

امید ہے کہ آپ بہ ہمہ وجوہ مع خیر ہوں گے۔

علیم صبا نویدی۔ چینائی

لسانی مسائل ومباحث

مصنف

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

معروضی طرزِ استدلال اور مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ اردو کے لسانی و تحقیقی مسائل، نیز تاریخی تناظر پر ایک جامع کتاب جس میں اردو کی سماجی اور تہذیبی جڑوں، نیز اردو میں قواعد نویسی کی روایت سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

E-mail: ephindia@gmail.com

Ph:0091-11-23216162

صفحات 264

قیمت..... -/200روپے

مصنف سے رابطہ

E-mail.:mirzakhalil2012@gmail.com

پریس ریلیز

آزمودہ کار معمّر صحافی احمد سعید ملیح آبادی کی زیرِ طبع خودنوشت ''میری صحافتی زندگی'' پیغامِ صداقت کا درجہ رکھتی ہے۔

کلکتہ کے آزمودہ کار صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے ''میری صحافتی زندگی'' کے عنوان سے اپنی وقیع صحافتی زندگی قلمبند کی ہے جو ف۔س۔اعجاز کے زیرِ اہتمام انشاء پبلی کیشنز، کلکتہ سے جلد شائع ہونے والی ہے۔اس کتاب میں ملیح آبادی صاحب کی ذاتی اور پیشہ ورانہ صحافتی زندگی کا بیانیہ لرزہ خیز سیاسی واقعات اور تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ تشدّد کی رونگٹے کھڑے کرنے والی وارداتوں سے پُر ہے۔ساتھ ہی اس میں مدبّرانہ حالات کے جائزے بھی شامل ہیں۔یہ کتاب ملیح آبادی صاحب کے پرستاروں کے علاوہ عہد حاضر کے صحافیوں کیلئے پیغامِ صداقت کا درجہ رکھتی ہے۔کئی ماجرے انکشافات سے کم نہیں۔وہ بم کی طرح پھوٹتے ہیں۔ان میں سچائی کا دھماکہ ہے۔احمد سعید ملیح آبادی فنِ صحافت کے تعلق سے خود ایک ادارہ ہیں۔

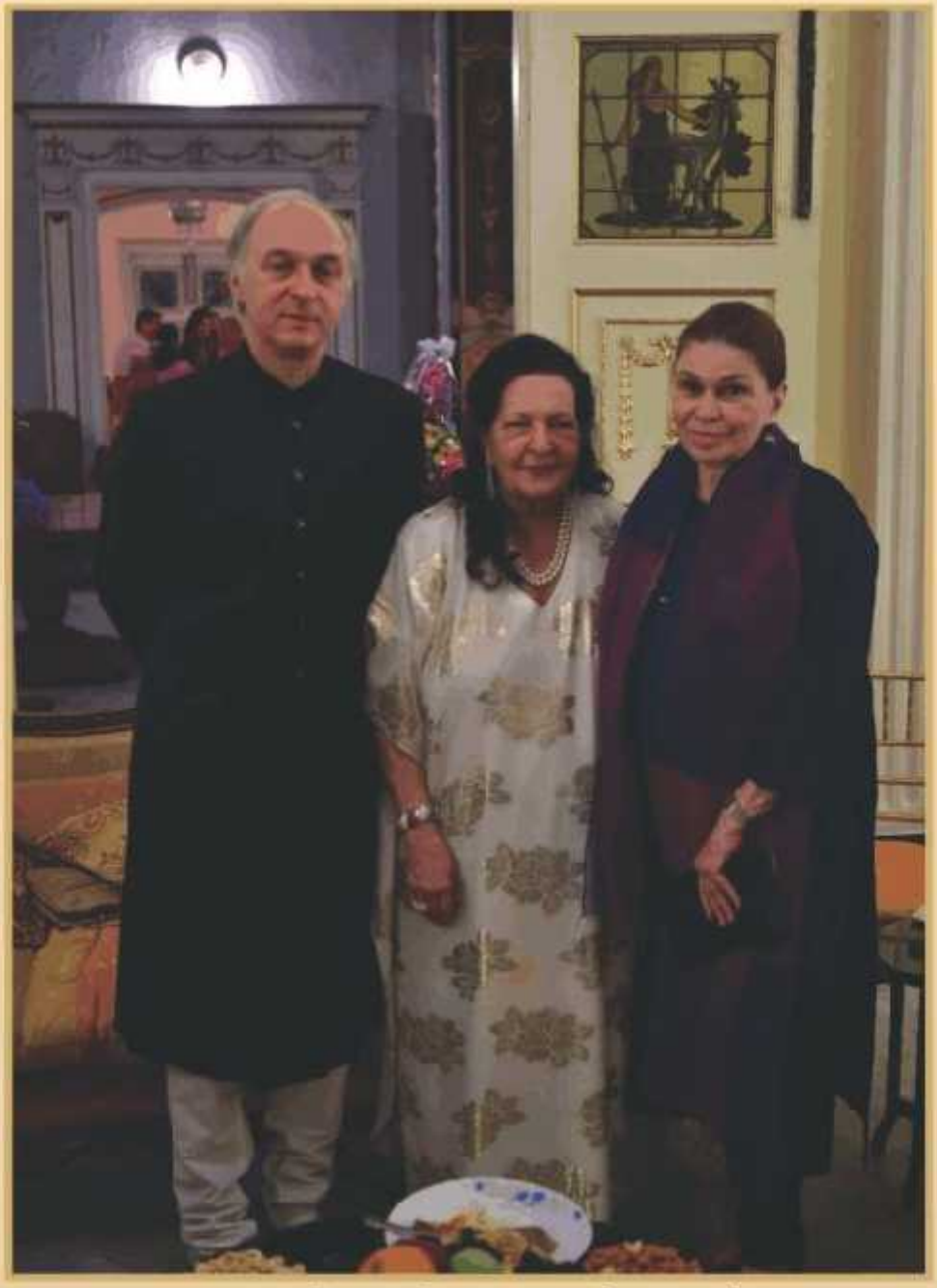

پرنسس اسریٰ، رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی اور پرنسس عظمت جاہ

Regd. No. LII/RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-02 February, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج تک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ **سیاست** نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روزمرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطیٰ، یوکے، یو ایس اے اور کینیڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

... اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، **سیاست** کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے ناواقف قارئین کے لوں تک رسائی حاصل کر کے یک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کا ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ **سیاست** حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : **24744180, 24603666, 24744109, 24744114**
Fax : Editorial : **040-24603188**, Advertisement : **24610379**
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام **سیاست**

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Tochaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ensas Ph : 040-23310467